پاکستان مستقبل کے امکانات

جوناتھن پیرس

ترجمہ: نائلہ رضا

فہرست

ابتدائیہ

مصنف بروکنگ انسٹیٹیوٹ کے سٹیفن کوہن، اٹلانٹک کونسل کے شجاع نواز، کنگز کالج لندن کے سٹیفن ٹینکل، جوشوا وایٹ (SAIS واشنگٹن) ناجل اینکسٹر (IISS) ایرک کوفمین (برکبیک Birkbeck) اناطول لیون (کنگز کالج لندن اور نیوامریکہ فاؤنڈیشن) اور ڈیوڈ واش بروک (ٹرینٹی کالج کیمرج) کا شکرگزار ہے، جنہوں نے متعلقہ موضوعات پر تبصرہ کیا اور پاکستان کو درپیش چیلنجز اور امکانات کے بارے میں آگاہی فراہم کی۔ مصنف خاص طور پر لیگٹم انسٹیٹیوٹ کے سینئر وائس پریذیڈنٹ ولیم امبوڈن کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہے جنہوں نے یہ رپورٹ تیار کرنے کی ہدایت کی اور گذشتہ سولہ ماہ کے دوران بڑے صبر سے مصنف کو موضوع اور اس کے تنقیدی پس منظر سے آگاہ کیا۔ رپورٹ کی اشاعت میں مدد دینے کیلئے مصنف لیگٹم انسٹیٹیوٹ کی ریسرچ اسسٹنٹ کلاڈیا شوارز کا بھی شکریہ ادا کرتا ہے۔

جوناتھن پیرس

جوناتھن پیرس لندن میں رہتے ہیں، وہ ایک سیاسی تجزیہ نگار اور اٹلانٹک کونسل آف یونائیٹڈ سٹیٹس، ساؤتھ ایشین سٹڈیز کے سینئر فیلو ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لیگٹم انسٹیٹیوٹ کے اسسٹنٹ فیلو اور انٹرنیشنل سنٹر فار دی سٹڈیز آف ریڈیکلائزیشن (ICSR) میں بطور ایسوسی ایٹ فیلو کام کرتے ہیں۔ وہ بکنگھم یونیورسٹی کے سنٹر فار سیکورٹی اینڈ انٹیلی جنس سٹڈیز میں وزیٹنگ لیکچرار ہیں۔ ۲۰۰۱ء میں لندن آنے سے قبل وہ نیویارک میں کونسل آن فارن ریلیشنز کے فیلو تھے۔ جہاں وہ کونسل کے مڈل ایسٹ اکنامک سٹریٹیجی گروپ کے چیئر میں پال اے وولکر کے نائب تھے اور مشرق وسطیٰ میں امن عمل کے بارے میں اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ یہیں انہوں نے انڈونیشیا میں جمہوری ارتقاء کے بارے میں شائع ہونے والی پہلی کتاب ''سہارتو کے بعد کی سیاست'' (بروکنگ CFR 1999) کی تیاری میں معاون ایڈیٹر کے طور پر بھی کام کیا۔ وہ ۵۔۲۰۰۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے سینٹ انٹونی کالج کے سینئر ایسوسی ایٹ رکن تھے، انہوں نے (Yale) ییل یونیورسٹی کے سٹین فورڈ لاسکول سے گریجویشن کی ہے۔

خلاصہ

یہ رپورٹ پاکستان کے آئندہ چند سال کے امکانی جائزے پر مبنی ہے، جس میں پاکستان کی معیشت، سیاست اور مختلف ملکوں کے ساتھ اس کے دوطرفہ تعلقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آئندہ چند سال کے دوران پاکستان تین طرح کے ممکنہ حالات کا سامنا کرسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ پاکستان ناکام ریاست بننے سے بچ جائے، لیکن اس کا ترقی کی راہ پر چل نکلنا بھی خاصا دشوار ہے۔ چونکہ پاکستان کو مختلف نوعیت کے لاتعداد مسائل کا سامنا ہے اس لیے زیادہ امکان یہ ہے کہ یہ جیسے تیسے ان مسائل سے نکل جائے۔

1۔ معیشت:

معیشت کے روشن امکانات کو دیکھا جائے تو آئندہ بیس برسوں میں یہ ملک آبادی کے اعتبار سے دنیا کا پانچواں اور سب سے بڑا مسلمان ملک بن جائے گا جس کی آبادی انڈونیشیا سے بھی زیادہ ہوگی۔ شرح پیدائش میں اس اضافے سے ملک میں نوجوانوں کی آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہوجائے گا، جو اگر تعلیم یافتہ اور برسر روزگار رہوں تو ملکی معیشت کے لئے انتہائی مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت تک چین اور بھارت میں آبادی میں اضافے کے نتیجے میں بڑھنے والی نوجوان آبادی بوڑھی اور ریٹائر ہوچکی ہوگی۔ پاکستان کے پاس اس بات کا بھی موقع ہے کہ

وہ اپنے مقامی خریداروں کی مارکیٹ کی مدد سے ملٹی نیشنل کمپنیوں کو ملک میں لانے کیلئے استعمال کرے۔ جس سے ملکی معیشت میں صحت مند مقابلے کا رجحان پیدا ہوگا اور الیکٹرونکس، اشیائے خوردونوش، گاڑیوں اور انجینئرنگ کی برآمدات میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ جبکہ بھارت کے ساتھ امن کے نتیجے میں پاکستان توانائی کی گذرگاہ اور جنوبی ایشیاء میں ترقی کے ایک ممکنہ انقلاب کے مرکز کی حیثیت اختیار کرسکتا ہے۔

معیشت کے تاریک پہلوؤں پر نظر دوڑائی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ملکی قیادت کے رویے میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں اور ملک شدید انتظامی مسائل سے دوچار ہے، سیاسی عدم استحکام، غربت کے خاتمے کے لئے مطلوبہ ترقی کے حصول میں ناکامی، بے روزگاری اور پسماندگی کے سبب عالمی برادری میں بھی پاکستان اپنی ساکھ گنوا چکا ہے، تعلیم کے شعبے میں سرمایہ کاری کی کمی کے باعث پاکستان کیلئے مشکل ہوگا کہ وہ اعلیٰ ٹیکنالوجی کا مرکز بننے کیلئے بھارت کا مقابلہ کرسکے۔ جبکہ ملک میں بڑھتے ہوئے تشدد کی وجہ سے سیاحت کے شعبے کو بھی اتنی مختصر مدت میں مفید اور منافع بخش بنانا ممکن نہیں۔ دوسری جانب آبادی میں ۷۔۲ فیصد کی شرح سے ہونیوالا اضافہ بھی ترقی کے چیلنج کا سامنا کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہے اور نوجوانوں کے حالات بھی خراب ہورہے ہیں۔ انہیں وجوہات کے سبب مصنف آئندہ ایک سے تین سال کے عرصے میں معیشت میں بہتری کے امکانات نہیں دیکھ رہا۔

ملک کے تیزی سے کم ہوتے وسائل کے خاتمے کو روکنے کیلئے ابتدائی طور پر آئی ایم ایف کے ایمرجنسی فنڈ کے علاوہ سخت معاشی پالیسیوں کی ضرورت تھی، جس کے بعد آئی ایم ایف معیشت کو آگے لے جانے کیلئے مزید اقدامات کرسکتی ہے تاکہ معاشی ترقی کی رفتار تیز کی جا سکے۔ جبکہ تیسرے مرحلے میں ملک کا آئی ایم ایف کے ایمرجنسی فنڈ پر انحصار ختم کرنے کیلئے فرینڈز آف ڈیموکریٹک پاکستان اور دیگر امدادی ادارے نجی شعبے اور براہ راست بیرونی سرمایہ کاری (FDI) میں اضافے کیلئے کوشش کرسکتے ہیں۔

2۔ سول وملٹری معاملات:

پاکستان کی تاریخ میں کوئی سول حکومت اپنی میعاد پوری نہیں کرسکی، کیا موجودہ حکومت اپنی

میعاد پوری کرنے والی پہلی سول حکومت ہو سکتی ہے؟ پاکستان میں سول و فوجی معاملات کے ارتقاء میں تین ممکنہ عوامل بہت اہم ہیں، فوج کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ، حالات کا جوں کا توں رہنا یا سٹیٹس کو اور جمہوریت کی مضبوطی۔ فوج چاہے گی کہ حالات کو جوں کا توں رکھ کر اور براہ راست فوجی مداخلت کے بغیر اپنا اثر و رسوخ بڑھایا جائے، کیونکہ اب شاید عوام آسانی سے فوجی مداخلت کی حمایت نہیں کریں گے۔ اس لیے موجودہ فوجی قیادت پس پردہ رہ کر اپنا کام کرنے کو ترجیح دے گی۔ اگرچہ اس وقت صدر اور وزیراعظم کا عہدہ سویلین افراد کے پاس ہے لیکن موجودہ حالات میں یہ ممکن ہی نہیں کہ پاکستان کے جمہوری ادارے خاندانی سیاست کے دائرے سے نکل کر مثبت انداز میں ترقی کر سکیں۔ یہ خاندانی سیاست اس وقت دو بڑی جماعتوں یعنی پیپلز پارٹی کے زرداری بھٹو خاندان اور مسلم لیگ ن کے شریف خاندان کے اردگرد گھوم رہی ہے۔

ان حالات میں پاکستان میں ممکنہ طور پر جمہوریت اور آمرانہ حکومت کے امتزاج پر مبنی نظام برقرار رہے گا۔ جسے ارسطو کے بقول ایک ملا جلا نظام کہا گیا ہے۔ چونکہ ملک کی دونوں بڑی جماعتوں نے گذشتہ بیس برس میں نئی سیاسی قیادت متعارف نہیں کرائی۔ اس لیے خیال ہے کہ مستقبل میں کسی مقبول کرشماتی قیادت کا ظہور شہری سیاست سے ابھرنے والی کسی سیاسی جماعت سے ہوگا۔ یہ قیادت قومیتی رجحانات کی حامل، امریکہ مخالف اور ملکی مسائل پر بیرونی دنیا کو مورد الزام ٹھہرائے گی جسے دیہات سے شہروں میں منتقل ہونے والی غریب ورکنگ کلاس اور قواعد و ضوابط سے آزاد طاقتور ملکی میڈیا کی حمایت حاصل ہوگی۔ چالیس برس پہلے ذوالفقار علی بھٹو کے بعد پاکستانی سیاست میں ایسی کسی سیاسی شخصیت کا سامنے نہ آنا ملکی سیاست کے ایک اہم تضاد کو ظاہر کرتا ہے۔ اگرچہ پاکستان مکمل طور پر جمہوریت کی جانب مائل نہیں ہو سکا تاہم معاشرہ آمریت یا آمرانہ سیاست کے بھی سخت خلاف ہے۔

3۔ اسلامی رجحانات:

اس دوران ملکی سیاسی فضا میں مذہبی جماعتوں کی اہمیت گھٹتی بڑھتی رہے گی۔ تاہم ان قوتوں کا حکومت یا ریاست پر قبضے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ مذہبی جماعتیں دیگر سیاسی جماعتوں (خصوصاً مسلم لیگ ن کی حکومت کی صورت میں) کے ساتھ اتحاد کی بدولت ملک کے نسبتاً آزاد

قانونی نظام پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتی رہیں گی۔ مذہبی جماعتوں کی جانب سے ملک میں شریعت کے نفاذ، احمدیوں اور عیسائیوں کو مزید دبانے کی کوششوں، امریکی مخالف مظاہروں اور اس نوعیت کی دیگر کارروائیوں کے امکانات بھی بدستور موجود رہیں گے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اگرچہ نواز شریف مذہبی جماعتوں اور گروپوں کی حمایت کرتے رہے ہیں لیکن ماضی میں ان کے دور میں فرقہ وارانہ تشدد کو روکنے کا ریکارڈ کافی اچھا ہے۔ خصوصاً انہوں نے شیعہ فرقے کے خلاف کارروائیاں کرنے والے سنی انتہاپسندوں کے خلاف کامیاب کریک ڈاؤن کیا۔

جہاں تک القاعدہ اور اس نوعیت کے دیگر مذہبی شدت پسندوں کا تعلق ہے تو وہ پہلے کی طرح ملک میں ایک محدود کردار کے حامل رہیں گے۔ ان کی موجودگی فاٹا کے کچھ علاقوں یا شاید کراچی کے علاوہ کسی اور جگہ نہیں ہے۔ جبکہ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ۲۰۰۱ء کے بعد القاعدہ کے کئی لوگ جماعت اسلامی کے ارکان کے گھروں یا ان سے متعلقہ جگہوں سے گرفتار ہوئے ہیں اور دونوں گروہوں کے درمیان نظریاتی قربت کی وجہ سے یہ زیادہ حیرت انگیز بات بھی نہیں ہے تاہم تشدد کے معاملے میں ان کے درمیان ایسی ہم آہنگی موجود نہیں ہے۔

چونکہ انتہاپسند پشتون گروپ صوبہ پنجاب کی حدود سے باہر پائے جاتے ہیں اس لیے پاکستانی طالبان ملکی سالمیت کے لئے ویسا خطرہ نہیں ہیں جیسا خطرہ پنجاب میں پائے جانے والے پنجابی انتہاپسند ہیں چونکہ پنجاب ملک کا سب سے اہم اور با اثر صوبہ ہے اور فوجی افسروں اور سپاہیوں کی زیادہ تعداد بھی اسی صوبے سے آتی ہے اس لیے پاکستان اور فوج کو اصل خطرہ طالبانائزیشن کی بجائے پنجاب سے تعلق رکھنے والے انتہاپسند گروپوں اور ان کے حامیوں کی اسلامائزیشن سے ہے۔ دوسری جانب غیر سیاسی اسلامی گروپوں مثلاً تبلیغی جماعت اور دیوبندی/ اہل حدیث مکتبہ فکر کے مدرسوں کے علاوہ اسلامی فلاحی تنظیمیں بھی عوام کے خیالات پر اثر انداز ہو رہی ہیں، ان میں خصوصاً ملک کی دیہی آبادی اور حال ہی میں گاؤں سے شہروں میں منتقل ہونے والے غریب ورکنگ کلاس کے لوگوں کی اکثریت شامل ہے۔ اس سے انتہاپسند گروپوں کو تحفظ اور انتہاپسندی کو بالواسطہ فروغ ملتا ہے۔ تبلیغی جماعت اور دیوبندیوں نے اپنے اجتماعات میں شدت پسندوں کی بھرتی کی اجازت دے رکھی ہے پاکستان میں کسی دیوبندی گروپ نے حالیہ بم دھماکوں کی اس طرح مذمت نہیں کی جس طرح بھارت کے دیوبندی حضرات نے کی ہے۔

جمعیت علمائے اسلام (جے یو آئی) اور جماعت اسلامی نے مسجدوں اور عام شہریوں پر ہونے والے حالیہ خودکش حملوں کی مذمت سے بھی گریز کیا ہے کیونکہ اس صورت میں انہیں خود اپنے اوپر حملوں کا خدشہ ہے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ اسلامائزیشن کے رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے مگر ان عناصر کی جانب سے ریاست پر قبضے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

4۔ پشتون قوم پرستی کا مستقبل:

اس وقت پشتون قوم پرستی کی تحریک ماضی کے مقابلے میں خاصی کمزور ہے اور پاک افغان سرحد کے دونوں جانب یہ تحریک ملک کی جغرافیائی سالمیت اور اندرونی استحکام کیلئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ صوبہ سرحد جہاں زیادہ تر پشتون آبادی رہتی ہے، وہاں کی حکومت مالی معاملات کے لئے اسلام آباد کی محتاج ہے اور صوبے کا نوے فیصد بجٹ وفاقی حکومت فراہم کرتی ہے۔ اس لیے وہ افغان سرحد کے دوسری جانب رہنے والے پشتونوں کے ساتھ مل کر پشتونستان کی تحریک کا حصہ نہیں بننا چاہتے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ افغان پشتون مالی طور پر بدحالی کا شکار ہیں۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پشتون قوم پرستی کی تحریک ختم ہو رہی ہے۔ پشتون اپنے صوبے کیلئے زیادہ صوبائی خودمختاری اور سکولوں میں پشتو زبان کی تعلیم جیسے مطالبات کرتے رہیں گے۔

دوسری جانب کراچی میں بھارت سے ہجرت کر کے آنے والی شہری مہاجر آبادی اور صوبہ سرحد اور بلوچستان سے کراچی میں بسنے والے پشتونوں کے درمیان شدید اختلافات بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ چونکہ فوج کا دائرہ اثر اور مفادات پنجاب کے اردگرد گھومتے ہیں اس لیے وہ کراچی کے ان دست وگریبان گروہوں کو قومی دھارے میں لانے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی، تاہم فوج نے کراچی میں مہاجر، پشتون اور بلوچ اختلافات کا فائدہ اٹھا کر ان گروہوں کے درمیان تصادم کو روکنے والی لازمی قوت کی حیثیت ضرور اختیار کر لی ہے اور یوں وہ نسلی ولسانی بنیادوں پر تقسیم ان گروہوں کو آمنے سامنے آنے سے روکتی ہے۔ کوئٹہ اور بلوچستان کے دیگر علاقوں پر امریکی ڈرون حملوں کے خلاف پاک فوج کی مخالفت اور تشویش کی ایک وجہ یہ ہے کہ فوج بلوچستان کی شورش پر وہاں کی پشتون آبادی کی مدد سے قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے اگر امریکہ بلوچستان میں افغان پشتون طالبان پر حملے کرتا ہے تو اس سے فوج کیلئے مقامی پشتونوں کی

حمایت حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔(۱)

اس بات کا کتنا امکان ہے کہ پاکستانی طالبان صوبہ سرحد، بلوچستان، کراچی اور دیگر علاقوں میں پشتو بولنے والوں پر غلبہ پالیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ پشتون سیکولر حلقے اپنے یہاں اسلامی تحریکوں کا بڑی شدت سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ تاہم طالبان پشتون شناخت کے معاشرتی تصور کو تبدیل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اور انہوں نے اسے پہلے سے زیادہ مذہبی رنگ دے دیا ہے۔ جس کی وجہ سے پشتون قوم پرستی کا معاملہ (جس میں صوبائی خودمختاری سرفہرست ہے) پس پشت چلا گیا ہے۔ امریکہ کی افغانستان میں موجودگی کا ایک نقصان یہ ہو گا کہ اس سے پاکستانی طالبان کو خود کو پشتونوں کے محافظ کے طور پر پیش کرنے کی آزادی مل جائے گی۔

5۔ پاکستانی طالبان کا مستقبل:

اب تک طالبان سرحد میں اپنے دائرہ کار میں اضافے کیلئے چھ مختلف طریقے استعمال کر چکے ہیں اور ممکنہ طور پر یہ وہ اسی طرح اپنا کام جاری رکھیں گے۔ انہیں فائدہ یہ ہے کہ صرف دو یا تین طریقوں کے ذریعے ہی وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو جائیں گے۔ سوات اور جنوبی وزیرستان میں کامیاب فوجی کارروائیوں سے پتہ چلتا ہے کہ فوج طالبان کو بزور قوت روک سکتی ہے۔ تاہم فوجی آپریشن کے بعد حکومت نے ان علاقوں میں بحالی وتعمیر نو کے عمل میں زیادہ دلچسپی نہیں لی، جس سے ایک تاثر یہ ہے کہ طالبان اس وقت کے منتظر ہیں جب ان علاقوں میں فوج کی دلچسپی ختم ہو جائے گی تو وہ وہاں واپس آ جائیں گے۔ طالبان کو شاید اس طرح آہستہ آہستہ نقصان پہنچانے کی پالیسی سے فائدہ پہنچتا ہے کیونکہ خودکش حملوں کے مسلسل جاری رہنے سے عوام کی ہمت جواب دے جائے گی۔ آخر پشاور اور دیگر شہروں میں کتنے خودکش حملوں کے بعد طالبان سے شکست تسلیم کی جائے گی۔ اس بات کے بھی ثبوت سامنے آئے ہیں کہ نوجوان فوجی افسر طالبان کے خلاف سخت جنگی اقدامات کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ برسوں میں صوبہ سرحد میں طالبان کے خلاف کارروائیوں کا اصل مقصد ان علاقوں میں تیزی سے ختم ہوتی ہوئی حکومتی عملداری کو بچانے کیلئے محض دکھاوے کی کارروائی ہو گی۔

6۔ پاک بھارت تعلقات:

پاکستان اور بھارت کے درمیان کسی قابل عمل امن سمجھوتے کے امکانات زیادہ روشن نہیں ہیں جس کی مدد سے یہ دو پرانے دشمن ایک ساتھ چل سکیں۔لیکن بھارت میں بتدریج یہ سوچ اور احساس پیدا ہو رہا ہے کہ پاکستان کی صورت میں ایک ناکام ہمسائے کی وجہ سے بھارت کے عالمی قوت بننے کی راہ میں رکاوٹ آ سکتی ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان کشمیر کا مسئلہ، نومبر ۲۰۰۸ء کے ممبئی حملے، پانی اور توانائی کے وسائل کی کمی، افغانستان میں بھارت کے کردار پر پاکستانی شکوک وشبہات اور ایک دوسرے کی خفیہ ایجنسیوں کے بارے میں پائی جانے والی بد اعتمادی دونوں ملکوں کے تعلقات کی خرابی کی اہم ترین وجوہات ہیں، دونوں ملکوں کے درمیان مذاکرات بھی انہیں موضوعات کے گرد گھومتے ہیں۔گذشتہ ناخوشگوار واقعات میں خفیہ ایجنسیوں کی ناکامیوں اور غلط اندازوں کا کافی دخل تھا، اس کے علاوہ بعض جنوبی ایشیائی تجزیہ نگاروں کی یہ سوچ بھی حالات کی خرابی کا سبب ہے کہ ایک خطرناک پاکستان مستقبل میں بھی کسی خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔

اچھی بات یہ ہے کہ اب کافی پاکستانی اس بات کو سمجھنے لگے ہیں کہ پاکستان کو اصل خطرہ بھارتی فوج سے نہیں بلکہ اس کے اپنے اندرونی مسائل سے ہے۔ برٹش کونسل کے پاکستانی نوجوانوں کے بارے میں کئے گئے ایک حالیہ سروے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ خود کو بطور مسلمان شناخت کرانے والوں کی تعداد بطور پاکستانی شناخت کرانے والوں سے پانچ گنا زیادہ ہے اور اتنا ہی فرق جمہوریت کے مقابلے میں شریعت کے نفاذ کے حامیوں کے درمیان تھا۔(۲)

اس سروے سے پاکستان کے لئے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ملکی وسائل کو دفاع کی بجائے بڑھتی ہوئی نوجوان آبادی کی بہتری کیلئے تعلیم، صحت اور روزگار کی فراہمی جیسے معمولی بجٹ رکھنے والے شعبوں پر خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات خود بھارت کے اپنے مفاد میں ہے کہ وہ پاکستان کو مسائل کی دلدل سے نکالنے کیلئے امریکہ کے رحم وکرم پر نہ چھوڑے اور خود اس کی مدد کرے۔خاص طور پر اس لیے کہ پاکستانی عوام امریکہ کو بھارت سے بھی زیادہ ناپسند کرنے لگے ہیں۔ بھارتی وزیر اعظم اس مسئلے سے آگاہ ہیں لیکن وہ فی الحال کانگریس کی قیادت سے اس معاملے پر اتفاق رائے حاصل نہیں کر سکے۔

7۔ پاک چین تعلقات:

پاکستان کی خارجہ پالیسی اور دفاعی معاملات میں کوئی ملک چین سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔پاک چین تعلقات کی نوعیت پاک امریکہ تعلقات سے بالکل مختلف رہی ہے، جس میں کئی وقفے آئے اور یہ دیگر کئی معاملات کے ساتھ مشروط بھی رہے۔چین کے ساتھ پاکستان کے تعلقات مسلسل، قابل اعتماد اور ماضی قریب تک بالکل غیر مشروط رہے ہیں۔ پاکستان اور چین کو تمام موسموں کا دوست کہا جا سکتا ہے، اس کے برعکس امریکہ اور پاکستان محض اچھے وقتوں کے دوست رہے ہیں۔

پاک چین تعلقات میں تناؤ کا ایک سبب یغور (Urghur) میں ہونے والے مظاہرے اور سنکیانگ صوبے میں بڑھتی ہوئی شدت پسندی ہے، جس کیلئے چین پاکستانی انتہاپسندوں کو ذمہ دار سمجھتا ہے۔چین کے بھارت کے ساتھ بڑھتے ہوئے تعلقات، پاکستان کے ساتھ پائیدار رابطے اور اب افغانستان میں اس کی سرمایہ کاری اور بڑھتے ہوئے سیاسی اثر ورسوخ کے سبب اس بات کا قوی امکان ہے کہ آئندہ عشرے میں چین جنوبی ایشیائی ملکوں میں انتہائی اہم مقام حاصل کر لے گا۔چین کی بڑھتی ہوئی معاشی طاقت اسے بطور ایک عالمی طاقت اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے میں کافی مدد دے رہی ہے، اس لئے وہ پاکستان کو مسائل کی دلدل سے نکلنے میں بھی مدد فراہم کر سکتا ہے۔چین پاکستان اور افغانستان کے سرحدی علاقوں میں امن کا خواہاں ہے کیونکہ بصورت دیگر اسے اپنے سرحدی علاقوں میں انتہاپسندی کا خدشہ ہے۔اس کے علاوہ وہ اپنے پچھواڑے میں امریکی موجودگی سے بھی خوش نہیں ہے۔

8۔ پاک امریکہ تعلقات:

دونوں ملک یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ انہیں مختلف وقتوں میں بنتے بگڑتے تعلقات اور محض اچھے وقت کے دوست جیسے تاثر کے خاتمے اور باہمی تعلقات کو زیادہ پائیدار بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ محض امریکہ کی جانب سے اہم فیصلوں میں پاکستان سے مشورہ لینے کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ علاقائی صورتحال کے بارے میں طریقہ کار وضع کرنے اور پاکستان کو ایک کردار

سوچنے کا معاملہ ہے، مثلاً اس بات کا انتظار کئے بغیر کہ آئندہ اٹھارہ ماہ بعد امریکہ اور نیٹو کے اس علاقے سے جانے کے بعد ان کے بغیر کیا حکمت عملی اختیار کی جائے گی، پاکستان ابھی امریکہ اور نیٹو کے ساتھ مل کر ایک لائحہ عمل طے کرلے۔ ایک ممکنہ آغاز یہ ہوسکتا ہے کہ کیا آئی ایس آئی افغانستان میں سیاسی مفاہمت کے لئے کوئی کردار ادا کرسکتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ پاکستان اپنے دفاعی مقاصد کے تحفظ کیلئے افغانستان میں طالبان کے کردار میں اضافے کا خواہاں ہے۔ پاکستانی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ طالبان کی واضح شکست کے بغیر ۲۰۱۱ء میں امریکہ اور نیٹو افواج میں کمی کے بعد افغانستان میں امریکی پالیسی اتنی موثر نہیں رہے گی اور اس صورت میں پاکستانی فوج کو افغان طالبان کے ساتھ معاملات طے کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا امریکی انتظامیہ کے عہدیدار رچرڈ ہالبروک، جنرل پیٹریاس، میک کرسٹل اور دیگر پاکستان کو افغان طالبان اور امریکہ کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرنے پر آمادہ کرسکتے ہیں۔ ایسا کردار جو پاکستان نے ۱۹۷۰ء کی دہائی کے آغاز میں امریکہ کو چین کے قریب لانے کیلئے ادا کیا تھا۔

افغانستان کا مستقبل اور پاکستان پر اس کے اثرات:

ایسا لگتا ہے کہ افغان طالبان نہ تو مکمل طور پر شکست سے دوچار ہوں گے اور نہ ہی انہیں فتح نصیب ہوگی۔ ایسے حالات سامنے آرہے ہیں کہ افغانستان کے مختلف علاقوں میں تقسیم کی سی صورتحال ہوگی جس میں کابل میں ایک غیر اہم حکومت موجود ہوگی۔ یہ کوئی بہت بری خبر بھی نہیں ہے کیونکہ طالبان ملک کے زیادہ تر حصے میں موجود نہیں ہوں گے، جیسا کہ وہ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں تھے۔ وہ افغانستان کی دیگر قوتوں (شمالی اتحاد و دیگر) کے ساتھ لڑائی کے باعث ایک حد تک محدود رہیں گے اور پاکستان پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوں گے۔ تاہم ابھی یہ واضح نہیں ہے کہ نیٹو فوج کی واپسی اور افغانستان میں کمزور حکومت اور اقتدار کی تقسیم کے اثرات پاکستان طالبان پر کیا ہوں گے۔ نیٹو کی جانب سے پاک فوج پر پاکستانی طالبان کے خلاف کارروائی کے دباؤ میں کمی کے بعد طالبان اور فوج کے درمیان کوئی باہمی سمجھوتہ ہوسکتا ہے، یا ممکن ہے کہ فوج طالبان کے خلاف کسی ٹھوس کارروائی کا فیصلہ کرے، کیونکہ اس وقت پاکستانی طالبان کے افغان ساتھی اپنے ملک میں قبائلی و نسلی جھگڑوں میں الجھے ہونے کی وجہ سے ان کی مدد کے قابل نہیں ہوں گے۔

مستقبل قریب میں پاکستان پر امریکہ کا دباؤ ہوگا کہ وہ پاکستانی طالبان کے خلاف آپریشن کو بڑھا کر پاکستان میں چھپے ہوئے افغان طالبان کی پناہ گاہوں تک لے جائے۔ پاکستان افغان طالبان کو پاکستانی طالبان سے الگ کرکے دیکھتا ہے اور انہیں اپنا دشمن نہیں سمجھتا۔ پاک امریکہ تعلقات اسی صورت میں آگے بڑھ سکتے ہیں جب دونوں فریقوں کے متضاد مفادات کا تحفظ ہوسکے۔ جنگ کو وسعت دینے کے بارے میں پاکستان پر امریکی دباؤ یا بلوچستان میں افغان طالبان رہنماؤں کے خلاف براہ راست امریکی حملوں پر رضامندی سے پاکستانی معاشرے خصوصاً فوج میں شدید اختلافات پیدا ہونے کا امکان ہے، جس سے ملک میں عدم استحکام بڑھ سکتا ہے۔ امریکہ کے اندر یہ احساس بھی شدت سے پایا جاتا ہے کہ اگر پاکستانی معاشرے یا فوج میں انتشار پیدا ہوا تو اس کا اثر ملک کے ایٹمی پروگرام کی سیکورٹی پر پڑسکتا ہے۔

پاکستان کے لئے امریکہ کا امدادی پروگرام کیری لوگر برمن بل درست سمت میں ایک قدم ہے۔ جس سے پاکستانی شہریوں کی معاشی و معاشرتی ترقی پر مثبت اثر ہوگا۔ تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں ملک اس بات کو یقینی بنائیں کہ اس پروگرام پر عملدرآمد سے پاکستانی شہریوں اور امریکی کانگریس دونوں کو مایوسی نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن پاکستان میں ۲۰۰۹ء میں کیری لوگر بل کا استقبال جس شدید مخالفت سے کیا گیا اس سے بل کو درست قدم سمجھنے والوں کے کان کھڑے ہوگئے۔ پاکستان میں امریکی مخالفت اس شدت سے پائی جاتی ہے کہ بعض اوقات امریکہ کیلئے فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ اسے پاکستان کے لئے کیا کرنا چاہیے۔

تعارف:

آج کل پاکستان پانچ اہم مسائل کا شکار ہے۔

۱۔ اندرونی ٹوٹ پھوٹ اور ملک کے مختلف حصوں میں حکومتی کنٹرول کا خاتمہ، جس سے ملکی سلامتی، یکجہتی اور خودمختاری سخت متاثر ہورہی ہے۔

۲۔ ملک بھر میں سیکورٹی اور دہشت گردی کا مسئلہ۔

۳۔ معیشت

۴۔ انتظامی معاملات بشمول کرپشن اور

۵۔ پاکستان کے امیج کی تعمیر نو

پاکستان ان مسائل کا کس طرح سامنا کرتا ہے،اس سے مندرجہ ذیل امکانات واضح ہوں گے۔

☆ ناکام ریاست

☆ مشکلات سے جیسے تیسے نکل جانا

☆ ترقی کی جانب سفر

آئندہ ایک سے تین برس میں اس بات کا تعین ہو جائے گا کہ ملک کس سمت گامزن ہے۔ پاکستانی ریاست عدم استحکام کا شکار رہی نہیں اس کی ذمہ دار بھی ہے۔لیکن یہاں اس کے خلاف شدید مزاحمت بھی موجود رہی ہے۔

☆ اب پاکستان کے مسائل جانے پہچانے ہیں اور یہ مسائل متعدد شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ان مسائل سے نہ صرف پاکستان خود عدم استحکام کا شکار ہوتا ہے بلکہ اس سے اس کے قریبی ہمسایہ ملک اور مغرب بھی متاثر ہوتے ہیں۔

☆ عالمی برادری پاکستان اور بھارت کے درمیان اچھے تعلقات میں گہری دلچسپی لیتی ہے۔ جو شاید اس وقت نیوکلیئر معاملات اور اختلافات کے ضمن میں دنیا کا سب سے خطرناک خطہ ہے۔۰۲۔۲۰۰۱ء میں دونوں ملکوں کے درمیان پیدا ہونے والا شدید اختلاف اس کی صرف ایک مثال ہے۔

☆ امریکہ اور یورپ کو تشویش ہے کہ پاکستان سے ایٹمی راز اب بھی دیگر ملکوں میں پہنچ سکتے ہیں۔

☆ پاکستان اور افغانستان کے بارے میں ایک تحقیق (ایک قابل عمل ریاست کا قیام اور انتہا پسندوں کو محفوظ پناہ گاہوں کی فراہمی روکنا) کے مطابق امریکہ افغانستان کے مسئلے کو واضح طور پر ایک مستحکم پاکستان کے ساتھ منسلک دیکھتا ہے۔درحقیقت کچھ امریکی پالیسی ساز نجی طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان افغانستان سے زیادہ بڑا مسئلہ ہے،لیکن امریکہ جس طرح اپنے وسائل کو افغانستان میں خرچ کر سکتا ہے اس طرح پاکستان میں نہیں کر سکتا۔

☆ امریکہ اور دیگر ممالک کو اس بات پر سخت تشویش ہے کہ مغرب کو نشانہ بنانے والے القاعدہ اور دیگر انتہا پسند گروپوں کو پاکستان میں محفوظ پناہ گاہیں میسر ہیں۔پاکستان کی ایٹمی صلاحیت بھی امریکی تشویش کی اہم وجہ ہے۔

اس تجزیے میں ان مسائل اور بین الاقوامی تشویش پر غور کیا گیا ہے اور اس ضمن میں آئندہ ایک سے تین سال کے دوران درپیش چیلنجوں،امکانات اور رویوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ رپورٹ درج ذیل آٹھ اہم موضوعات کا تفصیلی تجزیہ پیش کرتی ہے۔

☆ معیشت،پاکستان کی سلامتی کے حوالے سے ایسا مسئلہ،جس پر زیادہ توجہ مرکوز نہیں کی گئی۔

☆ سول وملٹری معاملات،ملکی سلامتی اور قومی دفاع کی فیصلہ سازی کے پس منظر میں ایک اہم مسئلہ،جو مغرب کے لئے خاصا اہم ہے۔

☆ ''اسلامائزیشن کا رجحان''، میں اس مسئلے کا جائزہ لیا جائے گا کہ آئندہ برسوں میں اسلامی پالیسیوں کا پاکستان پر کیا اثر ہوگا۔

☆ پشتون قومیت کا مستقبل پاکستان کی یکجہتی کے لئے اہم لیکن تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی حقیقت ہے۔

☆ پاکستانی طالبان کا مستقبل۔اس مسئلے کا تعلق نہ صرف پاکستان کی اندرونی سلامتی سے ہے بلکہ یہ پاکستان کی جانب سے افغانستان میں استعمال ہونے والی متبادل قوتوں سے متعلق بھی اہم مسئلہ ہے۔

☆ پاک بھارت تعلقات،کم از کم اس مسئلے پر پاکستانی فوجی حلقوں میں تشویش اور ممکنہ صورتحال پر غور کیا گیا ہے۔

☆ پاک چین تعلقات، یہ تعلقات کئی عشروں سے مضبوط رہے ہیں اور اب جنوبی ایشیا میں وسیع تر چینی کردار میں تبدیل ہو رہے ہیں۔

☆ پاک امریکہ تعلقات، آج کل دونوں ملکوں کے تعلقات شدید ترین دباؤ کا شکار ہیں۔

☆☆☆

باب 1

معیشت

دو وجوہات کی بنا پر اس رپورٹ کا آغاز معیشت سے کیا گیا ہے۔ پہلی یہ کہ اگرچہ معاشی معاملات کو ایک سے تین سال کی مختصر مدت میں جانچنے کی بجائے طویل تناظر میں دیکھنا چاہیے، لیکن معیشت، معاشرے میں فوج کے مقام اور پاکستان کے ہمسایہ ممالک خصوصاً بھارت کے ساتھ اس کے تعلقات ملکی سالمیت کے لئے بے حد اہم ہیں۔

دوسری بات یہ کہ عمومی طور پر خراب معاشی حالات اور تشویشناک میکرو اکنامک پوزیشن آئندہ برسوں میں نہ صرف سیاسی استحکام بلکہ امریکہ کے ساتھ تعلقات پر بھی براہ راست اثر انداز ہوگی۔ گذشتہ سال گرمی کے موسم میں بجلی کی کمی کے باعث شہروں میں ہونے والے فسادات اور عالمی برادری سے امداد کے لئے پاکستان کی مسلسل اپیلوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کو مختصر اور وسط مدتی معاشی استحکام کی اشد ضرورت ہے۔

معاشی امکانات کے سلسلے میں اس وقت حالات بہت خراب ہیں۔ ۲۰۰۸ء کے وسط میں جاری ہونے والی رپورٹوں کے مطابق معاشی حالات بہت اچھے تھے، لیکن یہ وہ وقت تھا جب معیشت مسلسل کئی سال ترقی کرتی رہی تھی اور معاشی ترقی اور سرمایہ کاری کی رفتار بھی بہت تیز تھی، جبکہ اوباما انتظامیہ کے لئے تیار کی جانے والی تھنک ٹینکس کی رپورٹوں میں معاشی صورتحال کمزور دکھائی گئی۔ یہ رپورٹیں پاکستان میں سیاسی تبدیلیوں اور عالمی کساد بازاری کے پس منظر میں تیار کی گئی تھیں۔ اس رپورٹ میں صورتحال کی متوازن تصویر کشی کی گئی ہے۔ اگر بعض پہلوؤں سے گلاس

آدھا خالی ہے تو کئی دیگر پہلوؤں سے آدھا بھرا ہوا بھی دکھا رہے ہیں۔

آدھا بھرا ہوا گلاس:

معیشت میں کئی مثبت چیزیں ہیں۔ پاکستان آبادی کے اعتبار سے دنیا کا چھٹا بڑا ملک ہے۔ خیال ہے کہ ۳۵۔۲۰۳۰ء کے درمیان اس کی آبادی انڈونیشیا سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ اقوام متحدہ کی ۲۰۰۹ء میں چھپنے والی ''آبادی کے وسط مدتی اندازوں (UN Medium Fertility Varient Projection) کے مطابق پاکستان ۱۷۰ ملین لوگوں کا ملک ہے، جن میں سے سو ملین افراد کی عمر پچیس سال سے کم ہے۔ اگر پاکستان ان سو ملین نوجوانوں کو تعلیم اور روزگار فراہم کر سکے تو یہ بڑھتی ہوئی آبادی ملکی ترقی کیلئے زبردست امکانات کا باعث بن سکتی ہے۔ (۳)

پاکستان تین دیگر بڑے ایشیائی ملکوں چین، بھارت اور انڈونیشیا کے ہمراہ مستقبل میں مقامی خریداروں اور کام کرنے والوں کی ایک بڑی منڈی ثابت ہوگا۔ یہ ایشیائی دیو اپنی صنعتوں کو اپنے ہی خریداروں سے ترقی دے سکتے ہیں۔ اس زاویے سے پاکستان کی پوزیشن چین اور بھارت سے بہتر ہے کیونکہ ان کی آبادی کا زیادہ حصہ بوڑھوں پر مشتمل ہوگا۔ جبکہ پاکستان آئندہ کئی عشروں تک اپنی آبادی میں نوجوانوں کی کثیر تعداد سے فائدہ اٹھا سکے گا۔ پاکستان کو درست سمت میں لے جانے کیلئے ضروری ہے کہ شہریوں کی آمدنی یا دولت میں اضافہ ہو، تا کہ وہ اپنے ملک میں بننے والی اشیاء خرید سکیں، وہ جتنی زیادہ خریداری کریں گے روزگار کے اتنے زیادہ مواقع پیدا ہوں گے۔ ترقی کے اس سفر کو اس لیے بھی بھروسہ مند سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ اس پر عمل درآمد کا آغاز ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۷ء کے دوران ہو چکا ہے۔ اس عرصے میں ہونے والی معاشی ترقی نج کاری، ڈی ریگولیشن اور معاشی آزادی کی مرہون منت تھی۔ اس عرصے میں برانڈ پاکستان میں ڈرامائی تبدیلیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

- ☆ جی ڈی پی (GDP) کی سرکاری شرح جو ۲۰۰۰۔۱۹۹۹ء میں ۶۵ ارب امریکی ڈالر تھی، ۰۸۔۲۰۰۷ میں بڑھ کر ۱۶۵ ارب ڈالر تک جا پہنچی، یعنی اس میں ڈھائی گنا اضافہ ہوا۔
- ☆ بیرونی سرمایہ کاری ۱۹۹۰ء کی دہائی میں پانچ سو ملین ڈالر سالانہ تھی، ۲۰۰۸ء میں بڑھ کر آٹھ ارب ڈالر تک ہو گئی۔

☆ بیرون ملک سے ترسیل زر کی شرح ۱۹۹۹ء میں ایک ارب تھی جو ۲۰۰۸ء میں بڑھ کر آٹھ ارب ڈالر ہو گئی۔

☆ ۱۹۹۹ء میں ترقیاتی اخراجات ڈیڑھ ارب ڈالر تھے جو ۲۰۰۷ء میں بڑھ کر ساڑھے سات ارب ڈالر ہو گئے۔

☆ درآمدات کا حجم ۱۹۹۹ء میں ساڑھے سات ارب ڈالر تھا جو ۲۰۰۷ء میں اٹھارہ ارب ڈالر ہو گیا۔

☆ جی ڈی پی میں سرکاری قرضے (پبلک ڈیٹ) کی شرح ۱۹۹۹ء کے مقابلے میں کم ہو کر ۲۰۰۸ء میں ۵۴ فیصد ہو گئی۔(۴)

اس عرصے میں پاکستان کی معاشی ترقی کی چند مزید مثالیں یہ ہیں۔

☆ غذائی اشیا کی بین الاقوامی تھوک کمپنیوں مثلاً ماکرو اور میٹرو نے پاکستان میں کام کا آغاز کیا اور اپنے کاروبار کے لئے کسانوں اور چھوٹے دکانداروں سے رابطے کا آغاز کیا۔

☆ ۱۹۹۹ء میں پاکستان میں تیس ہزار کاریں اور اسی ہزار موٹر سائیکل تیار ہوئے۔ ۲۰۰۸ء میں ان کی تعداد ڈھائی لاکھ کاروں اور تقریباً دس لاکھ موٹر سائیکلوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ آٹو سپیئر پارٹس کی مقامی صنعت نے خوب ترقی کی اور اس نے اپنا مال برآمد کرنا شروع کر دیا۔ ابتدائی طور پر مقامی مارکیٹ کے لئے ٹویوٹا، ہونڈا، سوزوکی، ہنڈائی اور شیورلیٹ کاریں اسمبل کرنے کیلئے پاکستان میں پلانٹ لگائے گئے، جن سے بڑی تعداد میں مقامی طور پر پرزے تیار ہونے لگے، پاکستان میں زیادہ تر درآمد شدہ کاروں کے پرزوں کو جوڑا جاتا تھا اور مقامی طور پر ان کے فالتو پرزے تیار ہوتے تھے۔ یہ چین کی آٹو انڈسٹری کے ساتھ چلنے کا ایک اچھا موقع بھی تھا۔ اس وقت تک نئے ڈیزائن کی صلاحیت حاصل کرنے پر کوئی توجہ نہیں تھی بلکہ تمام تر زور بین الاقوامی برانڈز کے لئے پرزے تیار کرنے اور بین الاقوامی سپلائی چین کا حصہ بننے پر تھا۔ اس وقت اسی کی ضرورت تھی کیونکہ اس سے روزگار کے مواقع پیدا ہوئے اور ٹیکنالوجی کی منتقلی ہوئی۔ نوے فیصد موٹر سائیکلیں مقامی طور پر تیار ہو رہی تھیں جبکہ کاروں میں یہ تناسب چالیس سے اسی فیصد اور ٹریکٹروں میں نوے فیصد تھا۔(۵)

☆ ۲۰۰۵ء میں بینکوں کی خریداری سے سرمایہ کاری میں اضافہ شروع ہوا۔ بین الاقوامی بینکوں کو پاکستان کی مقامی مارکیٹ میں موجود زبردست امکانات نظر آئے، کیونکہ سترہ کروڑ آبادی کے ملک میں صرف دو کروڑ بینک اکاؤنٹس تھے۔(۶)

مندرجہ بالا مثالیں بہت اہم ہیں۔ کیونکہ ان سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستانی معیشت کو ٹیکسٹائل کی روایتی صنعت سے آگے لے جایا جا سکتا ہے۔

حکومت کے خاتمے کے بعد:

مشرف حکومت کے خاتمے، بینظیر بھٹو کے قتل اور توانائی و غذائی اشیاء کی قیمتوں میں بے پناہ اضافے کے بعد پاکستانی معیشت تیزی سے زوال پذیر ہونے لگی۔ تاہم ۲۰۰۸ء میں معاشی معاملات میں بہتری آ گئی۔ کیونکہ (۱) پیپلز پارٹی کی قیادت میں ایک نئی منتخب جمہوری حکومت قائم ہوئی (۲) توانائی اور اشیائے خورد و نوش کی قیمتوں میں کمی ہوئی (۳) پاکستان ترقی یافتہ ممالک میں آنے والے معاشی بحران سے محفوظ رہا (جس کی ایک وجہ اس کی خاصی بڑی بلیک مارکیٹ تھی) اس لیے ملک کے حالات بہتر ہونے لگے۔

شدید تنقید کے باوجود زرداری حکومت کے بعض اقدامات سے حالات میں سدھار آیا۔

☆ پاکستان آئی ایم ایف اور دیگر عالمی امدادی اداروں سے امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ عالمی برادری زرداری حکومت کی جانب سے سوات میں شدت پسندوں کے خلاف کارروائی اور نومبر ۲۰۰۸ء کے ممبئی حملوں کے بعد حکومت کے اقدامات سے خوش تھی۔ اگرچہ نئی سول حکومت نے امریکہ اور بھارت کی تمام درخواستیں قبول نہیں کیں مگر اس نے شدت پسند تنظیموں مثلاً لشکر طیبہ کے خلاف کارروائی پر آمادگی ظاہر کی۔ جس پر عالمی برادری جمہوری حکومت کو اپنی حمایت کا ثبوت دینا چاہتی تھی۔ بیرونی دنیا نے حالات کا بغور جائزہ لیا، بین الاقوامی امدادی اداروں کے لئے حکومتی اقدامات خاصی اہمیت رکھتے تھے۔

☆ موڈی نے پاکستان کی ریٹنگ بڑھا کر مستحکم کی پوزیشن پر کر دی۔ بیرونی سرمایہ کاروں کی حوصلہ افزائی کے لئے قانون سازی اور ایک مصالحتی کمیشن قائم کیا جا رہا ہے جس میں

دیوالیہ قوانین کو یورپی کاروبار کے طور طریقوں کے مطابق ڈھالا جا رہا ہے، اسے مزید موثر بنانے کیلئے براہ راست وزیراعظم کی نگرانی میں دے دیا جائے گا۔[۷]

☆ اگست ۲۰۰۹ء میں وزیرخزانہ نے بیرون ملک سے آنے والی رقوم کی حوصلہ افزائی کیلئے متعدد اقدامات کا اعلان کیا تا کہ بیرون ملک پاکستانیوں کی جانب سے آنے والی رقوم کی ترسیل بہتر اور آسان بنائی جا سکے، کیونکہ یہ کیش رقم کی فراہمی کا اہم ذریعہ ہیں۔[۸]

ترقی کے سفر کیلئے مجوزہ دس اقدامات:

آدھے بھرے ہوئے گلاس کے تناظر میں دیکھا جائے تو پاکستان کی موجودہ معاشی مشکلات مستقل نہیں ہیں بلکہ انہیں مندرجہ ذیل طریقوں سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

ا۔سیکیورٹی صورتحال میں بہتری:

بیرونی سرمایہ کاری میں اضافے کیلئے سیکیورٹی صورتحال کی بہتری صرف ایک تجویز کی حیثیت ہی نہیں رکھتی بلکہ اسے لازم و ملزوم سمجھنا چاہیے کہ امن و امان بہتر بنا کر تشدد کے واقعات کو کم از کم کیا جائے۔ خراب امن و امان میں بیرونی سرمایہ کار پاکستان نہیں آئیں گے۔ CNN کے ایک پروگرام کے مطابق اگر ملک کے 20 سے 25 فیصد علاقوں میں بھی نارمل حالات نہیں ہیں تو اس صورتحال سے غیر محفوظ حالات کا تاثر ملتا ہے۔

۲۔آئی ایم ایف کی پالیسیوں میں تبدیلی:

عالمی سطح پر کیپٹیل مارکیٹ کی بندش کی وجہ سے بین الاقوامی نجی کیپٹیل مارکیٹس کے پاکستان میں بند ہونے اور ملک کی سیاسی صورتحال میں ابتری کی وجہ سے ملک کے معاشی حالات دگرگوں تھے۔ ان حالات میں اسے آئی ایم ایف کے ایمرجنسی امدادی فنڈ کی ضرورت تھی۔ لیکن امدادی فنڈ کے ساتھ منسلک پالیسیوں میں معاشی ترقی کی شرح کے مقابلے میں خسارے کی شرح کم رکھنے پر زور دیا گیا۔ آئی ایم ایف نے عام طور پر عالمی معاشی بحران کے بعد دیگر ملکوں کے پیکج میں کاؤنٹر سائیکلیکل پالیسی متعارف کرائی ہے، لیکن پاکستان میں صورتحال مختلف اور بے ضابطہ ہے۔ ملک کی قومی دولت بہت کم ہو چکی ہے، اسے ٹیکسوں میں اضافے کی اشد ضرورت ہے تا کہ معاشی سرگرمیوں کو مزید دباؤ سے بچایا جا سکے۔[۱۰]

پاکستان کے برعکس بھارت میں معاشی خسارے کی شرح تقریباً دوگنی ہے (پاکستان 4.9 اور بھارت 8 فیصد) اس کے باوجود بھارت میں کمرشل بینکوں کی شرح سود 6 فیصد ہے جو پاکستان میں سولہ فیصد ہے۔ اس کے نتیجے میں بھارتی معاشی ترقی کی شرح 6.7 کے مقابلے میں پاکستانی معیشت صرف ۷۔۲ فیصد کی معمولی شرح سے ترقی کر رہی ہے۔[۱۱]

۳۔براہ راست بیرونی سرمایہ کاری میں اضافہ:

معاشی سرگرمیوں میں اضافے کے امکانات پبلک سیکٹر کی بجائے پرائیویٹ سیکٹر سے زیادہ ہوتے ہیں۔ یو اے ای کی جانب سے پانچ ارب ڈالر کی ریفائنری کا مجوزہ منصوبہ براہ راست بیرونی سرمایہ کاری کی ایسی مثال ہے جس سے معیشت پر حقیقی اثر ہوتا ہے۔ فرینڈز آف ڈیمو کریٹک پاکستان ملٹی نیشنل کمپنیوں کی انتظامیہ کی حوصلہ افزائی کے ذریعے ایسی سرمایہ کاری میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

۴۔ٹیکسٹائل کے شعبے میں وسعت:

اگر پاکستانی ٹیکسٹائل کو مختصر مدت کے لیے بھی امریکی منڈیوں میں رسائی کا موقع مل جائے تو پاکستان چین اور بھارت سے مقابلہ کر سکتا ہے۔[۱۲] امریکی مارکیٹ میں ٹیکسٹائل کے شعبے کا بڑا حصہ انہی دونوں ملکوں کے پاس ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں ایک آزاد تجارتی معاہدے کی ضرورت ہے لیکن اس کیلئے مطلوبہ قانون سازی کیلئے کافی وقت درکار ہوگا۔

۵۔تھرمل انرجی:

دریائے سندھ کا وسیع و عریض پانی بڑی مقدار میں پن بجلی حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ جو تیل سے بنائی جانے والی مہنگی بجلی کا بہترین متبادل ہے۔ پن بجلی یا ہائیڈرو الیکٹرک پاور کا خرچ تیل سے بنائی جانے والی بجلی کا صرف دس فیصد ہے۔

۶۔خوراک اور پانی:

بڑے ڈیموں سے نہ صرف سستی بجلی حاصل ہوتی ہے بلکہ ان میں ذخیرہ ہونے والا پانی کاشتکاری کیلئے بھی بہت مفید ہے۔ پگھلتے گلیشیئرز اور بارش کے پانی کو بھی ان ڈیموں میں بہترین طریقے سے ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔

۷۔زرعی کاروبار:

عالمی سطح پر غذائی اشیاء کی قیمتوں میں طویل المدتی اضافے سے پہلی بار پاکستانی کاشتکار کو زراعت سے منافع کمانے کا موقع ملا۔ اگرچہ کھیت مزدوروں کی بڑی تعداد شہروں میں منتقل ہو رہی ہے، ایسے میں دیہات میں رہنے والے کاشتکاروں کیلئے اچھا موقع ہے کہ زراعت کو کاروبار کی شکل دیں، لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ انہیں مطلوبہ مقدار میں پانی ملنا چاہیے۔ آئی ایم ایف کے پاکستانی نمائندے کے مطابق سال ۲۰۰۹ء میں پاکستان میں چوبیس ملین ٹن گندم پیدا ہوئی۔ زرعی پیداوار میں مزید اضافے سے پاکستان کی شرح ترقی ۶۔۵ فیصد ہو سکتی ہے۔[۱۳]

۸۔دیہی آبادی کی شہروں میں منتقلی:

مستقبل کے مینوفیکچرنگ مراکز بننے کے امکانات: اگرچہ زرعی پیداوار مجموعی ملکی پیداوار میں اضافے کا سبب بنتی ہے لیکن اس وقت زرعی شعبے سے وابستہ افراد کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہاں سے مزید لوگ مینوفیکچرنگ اور دیگر شعبوں میں جائیں گے۔ پہلے ہی آبادی کی بڑی تعداد کھیتوں کو چھوڑ کر شہروں کا رخ کر رہی ہے۔[۱۴] زرعی شعبے میں صرف دس فیصد آبادی کی ضرورت ہے جبکہ اس وقت ساٹھ فیصد لوگ اس شعبے سے وابستہ ہیں۔ آبادی کی بڑی تعداد کی شہروں میں منتقلی کا مطلب یہ ہے کہ مستقبل میں پاکستان کی ترقی شہروں کے مینوفیکچرنگ اور سروس سیکٹر کے ذریعے ہوگی۔ اس مقصد کیلئے نہ صرف بیرونی سرمایہ کاری اور صنعتی ٹیکنالوجی کی منتقلی کی ضرورت ہوگی بلکہ گاؤں سے شہروں میں منتقل ہونے والوں کو مختلف ہنروں کی تربیت بھی دینا ہوگی۔

۹۔گیس پائپ لائن، توانائی کی منتقلی کا راستہ:

بھارت کے ساتھ امن کی صورت میں پاکستان سنٹرل ایشیا اور گلف، چین اور بھارت کے درمیان اپنی جغرافیائی پوزیشن کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اپنی اسی پوزیشن کے باعث وہ جنوبی ایشیاء میں آنے والے ترقی کے ممکنہ انقلاب سے بھی بھرپور مستفید ہو سکتا ہے، جس کے بارے میں خیال ہے کہ وہ مشرقی ایشیائی ملکوں میں ہونے والی انقلابی ترقی کو پیچھے چھوڑ دے گا۔ صرف توانائی کے شعبے میں ہی وہ ایران سے براستہ پاکستان بھارت جانے والی گیس

پائپ لائن (IPI) اور ترکمانستان و افغانستان سے بھارت جانے والی (TAPI)[۱۵] کی گذرگاہ بن کر بے حد اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

ٹرانسپورٹ کا بنیادی ڈھانچہ:

تجارتی ترقی میں نیشنل ہائی وے کی بڑی اہمیت ہے جو جنوب میں کراچی اور گوادر کو شمال میں چین کی سرحد سے اور شمال مشرق میں افغان سرحد سے ملاتی ہے۔

گلاس، آدھا خالی:

مندرجہ بالا حقائق کو ایک دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو ایک پریشان کن تصویر نظر آتی ہے۔

آبادی کا ٹائم بم:

آبادی میں بے پناہ اضافے ہی کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ پاکستان اپنے پڑوسی ملکوں ایران اور بنگلہ دیش کے برعکس اپنی مجموعی شرح پیدائش یعنی ٹوٹل فرٹیلیٹی ریٹ (TFR) کو ا۔۴ فیصد سے کم رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔[۱۶] ممکن ہے بعض پاکستانی بلند شرح پیدائش کو مثبت سمجھتے ہوں کہ اس سے ملک کو ترقی کیلئے ورک فورس میسر آ سکے گی۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بلند شرح پیدائش کے نتیجے میں نوجوانوں کی تعداد میں ہونے والے مسلسل اضافے سے انہیں تعلیم، صحت اور روزگار فراہم کرنے کیلئے ملکی وسائل پر بے پناہ بوجھ پڑے گا۔ پاکستان اس مسلسل بڑھتی ہوئی آبادی کو کس طرح مطلوبہ تعداد میں سکول اور تربیت یافتہ اساتذہ فراہم کرے گا۔ جبکہ مستقبل میں ان کی تعداد میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔[۱۷] ماہرین آبادی کے مطابق نوجوانوں کی آبادی میں مسلسل اضافہ آزاد اور پائیدار جمہوریت کے لئے سودمند ثابت نہیں ہوتا۔[۱۸] اس خطرے میں کمی کے امکانات یہ ہیں کہ آمدنی میں اضافے اور دیہاتی آبادی کی شہروں میں منتقلی سے شرح پیدائش کم ہوگی کیونکہ شہروں میں رہنے والی عورتیں دیہی عورتوں کی نسبت کم بچے پیدا کرتی ہیں۔

فریقین میں احساس ذمہ داری پیدا کرنا، یہ ایک اور بڑا چیلنج ہے، یعنی فی خاندان آمدنی کی انتہائی نچلی سطح۔ ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۷ء کے درمیان پاکستان کی فی کس آمدنی تین سو ڈالر سالانہ سے بڑھ کر ایک ہزار ڈالر ہو گئی۔ ان شاندار اعدادو شمار کو برقرار رکھنے کیلئے پاکستان کو مسلسل بیس برس

تک اس بلند شرح ترقی کو برقرار رکھنا ہوگا۔ تبھی عام پاکستانی خاندان کی زندگی میں حقیقی تبدیلی آ سکتی ہے۔ فی کس آمدنی کی شرح تین ہزار ڈالر تک ہونے کے بعد ہی عام لوگوں کے لئے ممکن ہو سکے گا کہ وہ اس نظام کے فریق بن سکیں۔ اس وقت فی کس آمدنی ایک ہزار ڈالر ہے لیکن شہروں میں منتقل ہونے والے سابقہ کھیت مزدور غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ ان حالات میں ان کے لئے بہت مشکل ہے کہ وہ نظام تبدیل کرنے کے دعوے کرنے والے شدت پسند مسیحاؤں کے پیغام کو رد کر سکیں۔(۱۹) مناسب معاشی ترقی کے حصول میں ناکامی کے سبب پاکستانی عوام کیلئے سیاسی قیادت کا ساتھ دینا اور سیکورٹی فورسز کے لئے دہشت گردی کا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہوگا۔ کیونکہ ابھی ان کے پاس کھونے کیلئے کچھ زیادہ نہیں ہے، ایک اور زاویے سے دیکھئے۔ تین فیصد سالانہ کی شرح سے ترقی کی صورت میں دس لاکھ ملازمتیں پیدا ہوں گی لیکن اگر شرح ترقی سات فیصد ہو جائے تو پچیس لاکھ افراد کو روزگار مل سکے گا۔ ملک کی شرح ترقی ۲.۷ فیصد رہنے کی صورت میں صورتحال ہمیشہ سے زیادہ خطرناک ہو سکتی ہے۔ **اکنامک انٹیلی جنس یونٹ کے مطابق ۲۰۱۰ء کے وسط میں ختم ہونے والے مالی سال میں پاکستان کی شرح ترقی ۲.۷ فیصد رہے گی، جس کے مطابق ملک کی صورتحال ایک ناکام ریاست اور حالات سے جیسے تیسے نکل جانے کے درمیان ہوگی۔**(۲۰)

معیشت کے تاریک پہلو، مزید وجوہات:

☆ تعلیم کے شعبے میں سرمایہ کاری میں کمی کے سبب پاکستان کیلئے مشکل ہوگا کہ وہ ٹیکنالوجی کا مرکز بننے کیلئے بھارت کا مقابلہ کر سکے۔ جبکہ ملک میں بڑھتا ہوا تشدد سیاحت سے حاصل ہونے والی آمدنی کے امکانات کو محدود کر رہا ہے۔

☆ پاکستان کے معاشی نظام کے کچھ اہم مسائل ہیں، جن میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ بیرون ملک سے بھیجی جانے والی نجی رقوم پر بہت زیادہ انحصار کیا جاتا ہے، جبکہ درآمدات (ایکسپورٹ) کے سلسلے میں معیشت کا رویہ بہت محدود اور غیر ترقی یافتہ ہے (ایکسپورٹ میں زیادہ تر ٹیکسٹائل پر انحصار کیا جاتا ہے)۔ اس کے علاوہ ملک میں ٹیکس دینے والوں کی تعداد انتہائی کم ہے اور ملکی ادارے بہت کمزور ہیں۔(۲۱)

☆ اکیسویں صدی میں صوبہ پنجاب کے دس کروڑ لوگ ایسی زمینوں پر رہ رہے ہوں گے جن میں کاشت کی صلاحیت دن بدن کم ہو رہی ہے۔ پاکستان کے اہم دریاؤں کے دہانے بھارت میں ہیں اور ان کے پانی کو بھارت کنٹرول کرتا ہے، دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات اچھے بھی ہوں تو پاکستان میں پانی کی کمی کے امکانات بہت واضح ہیں۔

☆ لیڈرشپ کے بحران کی وجہ سے ملک طرح طرح کے مسائل کا شکار ہے، معاشی بدانتظامی سیاسی نظام کا حصہ بن چکی ہے۔

☆ سیکورٹی کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ جس کی ایک مثال ستمبر ۲۰۰۸ء میں میریٹ ہوٹل پر ہونے والا بدترین دہشت گرد حملہ ہے۔ جس کے بعد پورے ملک میں اس نوعیت کے لاتعداد حملے ہوئے۔ ان واقعات سے ملک میں بیرونی سرمایہ کاروں کے اعتماد کی بحالی، سرمایہ کاری کے امکانات اور پاکستان کے امیج کی بحالی کا امکان شدید متاثر ہوا۔(۲۲)

☆ پاکستانی معیشت توانائی کے بحران اور خوراک کی قیمتوں میں اضافے سے شدید متاثر ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ گذشتہ دو سال کے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے، خام تیل کی قیمتوں میں اضافے سے شہروں میں فسادات پھوٹ پڑے، جن سے سول حکومت کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔

☆ اگرچہ امریکہ کی جانب سے ڈیڑھ ارب ڈالر سالانہ کا غیر فوجی امدادی پیکج (کیری لوگر برمن) پاکستان کیلئے کافی اہمیت کا حامل ہے (شاید بعض لوگوں نے اس بات پر غور نہ کیا ہو کہ پاکستان میں اس پیکج کا استقبال سرد مہری سے کیا گیا تھا) لیکن ملک کی حقیقی معاشی ترقی کیلئے تجارت کی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہے۔ تاہم ابھی یہ واضح نہیں کہ پاکستان کو امریکی و یورپی منڈیوں میں تجارتی رسائی حاصل ہو سکے گی یا نہیں۔ پاکستان اور امریکہ کے درمیان دوطرفہ سرمایہ کاری کا معاہدہ بھی ختم ہو چکا ہے جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ امریکی صنعتوں نے بعض شعبوں کو پاکستان کیلئے کھولے جانے کی مخالفت کی تھی۔ اس کے علاوہ پاکستانی قبائلی علاقوں کیلئے تیار کیا جانے والا منصوبہ "ری کنسٹرکشن پر چونٹی زونز" (ROZ) (۲۳) بھی ابھی تک کانگریس سے منظور نہیں کرایا جا سکا۔ یہ منصوبہ منظور ہو بھی گیا تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ ٹیکسٹائل کے شعبے کی کئی اشیاء کو اس سے نکال دیا

جائے گا۔ پاکستانی ٹیکسٹائلز کو امریکی منڈی میں کم از کم رسائی سے بھی محروم رکھا گیا ہے، کیونکہ امریکہ ٹیکسٹائل لابی بہت طاقتور ہے، تاہم امکان ہے کہ پاکستان کو توانائی اور ذرائع آمدورفت کے بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کیلئے امریکی سرمایہ کاری کی بعض رعایتیں دے دی جائیں گی۔

پاکستانی معیشت کو مستحکم ترقی کیلئے اپنی برآمدات کو توسیع دینا پڑے گی۔ اس مقصد کیلئے پاکستان کی مڈل کلاس ایک اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ پاکستان اور افغانستان کے لئے امریکہ کے خصوصی نمائندے رچرڈ ہالبروک کے مشیر برائے پاکستان ولی نصر نے عرب اور مسلمان ملکوں میں نئی ابھرنے والی مڈل کلاس کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں اسے تبدیلی کی قوت قرار دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں پاکستان کی شہری مڈل کلاس کے ابھرنے کے امکانات کا ذکر کیا گیا ہے جو ایک مستحکم سیاسی نظام کے حصول میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ (۲۴)

قابل غور پہلو:

☆ پاکستان کی سٹریٹیجک پوزیشن، آبادی کی صورتحال اور وسائل کو دیکھا جائے تو تیز رفتار ترقی ممکن نظر آتی ہے۔ خوراک اور توانائی کے شعبوں میں ترقی سے پاکستان کے سیاسی نظام کو مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔ اصل چیلنج یہ ہے کہ یہ خود کو جنوبی ایشیاء میں ہونے والی ترقی کے ساتھ منسلک کرلے، جو شاید دنیا کا سب سے زیادہ منتشر خطہ ہے۔

☆ دیکھنا ہوگا کہ حکومت "پاکستان برانڈ" کو کس طرح دوبارہ تعمیر کرتی ہے۔ جس کے ذریعے ۲۰۰۷ء میں براہ راست بیرونی سرمایہ کاری (FDI) کے لئے ۸ ارب ڈالر کی رقم پاکستان آئی تھی۔ اس تجربے کو دہرانا مشکل ہوگا کیونکہ مشرف دور میں آنے والی زیادہ تر سرمایہ کاری سوائے سٹیل مل کے دیگر سرکاری صنعتوں کے نج کاری پروگرام کے ذریعے آئی تھی اور اب ان میں سے زیادہ تر فروخت ہوچکی ہیں۔ (۲۵) موجودہ شارٹ ٹرم ایمرجنسی کے بعد بیرونی سرمایہ کاری اور پرائیویٹ کیپٹل مارکیٹیں پاکستان کا مستقبل ہیں۔ زرعی کاروبار (ایگروبزنس) اور مینوفیکچرنگ دونوں شعبوں میں مقامی اور ایکسپورٹ مارکیٹ کے امکانات موجود ہیں۔ مینوفیکچرنگ کے شعبے میں کامیابی کا تعین اس بات سے بھی ہوگا

کہ پاکستان اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کو ضروری تعلیم اور روزگار فراہم کرکے کس طرح اپنے فائدے کیلئے استعمال کرسکتا ہے۔

☆ شہری آبادی میں اضافے کے سبب شہروں کا امن وامان متاثر ہوسکتا ہے۔ مثلاً ۲۰۰۹ء کی گرمیوں میں بجلی کے بحران اور شوگر مافیا کی جانب سے چینی کی قیمتوں میں من مانے اضافے کے باعث ہونے والے ہنگامے اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ پاکستانی شہروں کے یہ مسائل ایک بھیانک رخ اختیار کرسکتے ہیں۔

☆ محدود وسائل کے سبب انتہاپسندی اور دہشت گردی سے نمٹنے کی نیم دلانہ کوششیں بھی پاکستانی معیشت کیلئے بہت مہنگی ثابت ہوسکتی ہیں۔ سوات اور فاٹا میں دو بڑے فوجی آپریشنوں سے بجٹ پر شدید دباؤ پڑا۔ سوات کے بے گھر افراد کے وسط اور طویل مدتی مسائل کے حل کیلئے بھی اربوں ڈالر درکار ہوں گے۔

☆ موجودہ حکومت پر شدید دباؤ ہے کہ وہ پرائیویٹائزیشن جیسی غیر مقبول پالیسیوں پر عمل درآمد کی رفتار کم کردے اور بےنظیر انکم سپورٹ پروگرام (BISP) جیسے منصوبوں کو عوامی حمایت سے تعبیر کیا جارہا ہے، جس کے تحت ۲۵ لاکھ غریب خاندانوں میں تقریباً ۳۳ ڈالر (ڈھائی سے تین ہزار روپے) کی رقم ہر دو ماہ بعد بانٹی جاتی ہے۔ خوراک اور توانائی پر دی جانے والی رعایتیں ہمیشہ جاری نہیں رہ سکتیں، خصوصاً آئی ایم ایف کے پروگرام کے تحت، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان معاشی پالیسیوں کے بارے میں سخت فیصلے کرپائے گا یا نہیں؟ وہ جب بھی یہ اہم کام کرے گا تو اسے ان فیصلوں کے سیاسی نتائج بھگتنا ہوں گے۔

☆☆☆

باب 2

سول اور ملٹری تعلقات

سول وملٹری معاملات:

۱۹۵۸ء میں ملک کے ابتدائی برسوں میں جب جنرل ایوب خان نے ملک کے اقتدار پر قبضہ کرلیا، اس وقت سے لے کر آج تک پاکستانی فوج کسی نہ کسی صورت میں اقتدار میں رہی ہے۔ کبھی مارشل لاء کی صورت میں اور کبھی سول اقتدار کے پس پشت رہ کر۔ سول اور ملٹری تعلقات مرکزیت پر مبنی سیاسی ڈھانچہ کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ سیاسی اور فوجی دونوں قوتوں نے اقتدار میں آکر صوبوں کے اختیارات میں کمی کی اور مرکز کی قوت میں اضافہ کیا۔ اگرچہ اس کے پس منظر میں متعدد دیگر پیچیدہ وجوہات بھی تھیں مگر عام طور پر ایک وجہ بھارت کے خلاف قوم کو متحدہ کرنا تھا۔

پاکستانی حکومت اور اقتدار کی نوعیت بدلتی رہی ہے لیکن سول یا ملٹری دونوں قسم کی حکومتوں میں بعض چیزیں یکساں رہیں، جس سے حالات میں زیادہ تبدیلی کے امکانات پیدا نہیں ہو سکے۔

فوج کی بالادستی:

سیاسی فیصلہ سازی میں فوج کو ہمیشہ ایک بالادست کردار حاصل رہا۔ حتیٰ کہ بظاہر سول حکومتوں میں بھی پالیسی سازی پر فوج کا کنٹرول برقرار رہا، خصوصاً خارجہ پالیسی اور ملک کے دوستوں اور دشمنوں سے تعلقات کی نوعیت کا فیصلہ ہمیشہ فوج ہی کرتی رہی۔

اہم فیصلوں پر فوج کا کنٹرول:

اکثر اہم اندرونی اور بیرونی امور پر فوج اور سویلین طاقتوں کے درمیان طاقت کا توازن تبدیل ہوتا رہا، مگر تبدیلی کی نوعیت کافی محدود رہی، مندرجہ ذیل مخصوص معاملات پر فوج کی بالادستی ہمیشہ قائم رہی۔

- ☆ خارجہ پالیسی کی تشکیل میں، خاص طور پر بھارت، افغانستان اور امریکہ کے ساتھ تعلقات طے کرنے میں۔
- ☆ فوج کی اپنی (پرموشن) ترقیوں اور سہولتوں کے تعین میں۔(۲۶)
- ☆ کارپوریشنز اور ویلفیئر ٹرسٹوں کے ذریعے ملکی صنعت، کمیونیکیشنز اور ٹرانسپورٹ کے شعبوں تک فوج کی رسائی۔(۲۷)
- ☆ جنگ کا فیصلہ، جس کے ذریعے فوج مقامی شورشوں اور بیرونی طاقتوں کو مطمئن کرتی ہے۔
- ☆ بجٹ کے مجموعی ڈھانچے کی تشکیل، جس میں فوج، سماجی خدمات اور ترقی کے لئے بجٹ میں رقوم مختص کی جاتی ہیں۔
- ☆ پاکستان کے نیوکلیئر ہتھیاروں کے بارے میں تمام تر فیصلہ سازی۔

فوج کا اپنی طاقت میں باقاعدگی سے اضافہ کرنا:

جب کبھی فوجی اقتدار کے جائز ہونے پر کثرت سے سوالات اٹھنے لگتے ہیں تو فوج اقتدار عارضی طور پر ایک کمزور سویلین حکومت کے حوالے کر کے کچھ وقت کیلئے بیرکس میں واپس چلی جاتی ہے۔ جنرل اشفاق پرویز کیانی کی کمان میں اس وقت فوج کا بیرکوں میں واپس جانا اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس معاملے کا جائزہ دو زاویوں سے لیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان کے پیشرو جنرل مشرف نے اپنی میعاد میں بہت زیادہ اضافہ کیا اور دوسرے یہ وہ ایک پروفیشنل فوجی کی شہرت رکھتے ہیں۔ فوج کو حکومت چلانے کی کوئی تربیت نہیں ہوتی اور ان کے بار بار اقتدار میں آنے سے یہ بات ثابت بھی ہو چکی ہے، لیکن اس کے باوجود فوج عوام کی نظر میں اپنے اقتدار کو جائز اور فائدہ مند ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی لئے اسلام آباد کا اقتدار فوج اور سویلین چہروں کے درمیان تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

فوجی حکومت کو سویلین ثابت کرنے کی مجبوری:

فوجی رہنماؤں کی جانب سے اقتدار پر بلاشرکت غیرے کنٹرول کے ادوار میں بھی انہیں اپنی حکومتوں کو جائز اور قانونی ثابت کرنے کیلئے جمہوریت کا لبادہ اوڑھنا پڑا، جسے جمہوریت کے ساتھ ایک مذاق ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ایک جانب فوج ملک کے تمام تر اقتدار کی مالک ہے اور تمام اہم فیصلے کرتی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے مقامی اور بین الاقوامی طور پر اپنی حکومت کو جائز ثابت کرنے کیلئے سیاستدانوں اور سیاسی جماعتوں سے تعلقات قائم کرنے پڑتے ہیں۔اگرچہ پاکستانی معاشرے میں کوئی دوسرا ادارہ یا فریق فوجی اقتدار کیلئے خطرہ نہیں بنتا، اس کے باوجود فوج سویلین سیاسی طاقتوں اور بیوروکریسی کے بغیر اپنا اقتدار قائم نہیں رکھ سکتی۔

دوسری جانب سویلین لیڈرشپ مختلف اندرونی چیلنجز (مثلاً طالبان سے نمٹنا وغیرہ) کم اہم خارجہ تعلقات اور ریاست کے روزمرہ امور چلانے کے لئے متعدد مقامی، اقتصادی اور ترقیاتی معاملات کا سہارا لیتی ہے۔

زرداری کی سربراہی میں قائم سول حکومت نے اب تک بعض نیم دلانہ کوششیں کی ہیں کہ فوج کے زیر کنٹرول بعض معاملات پر کچھ اختیار حاصل کیا جا سکے، لیکن اس پر انہیں فوج کی جانب سے مسلسل ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔اس وقت سول حکومت کے پاس جو بھی اختیارات ہیں، ان کی ایک وجہ یہ ہے کہ فوج اس وقت خود سامنے آنے سے کترا رہی ہے، لیکن یہ صورتحال کسی بھی وقت تبدیل ہو سکتی ہے۔سول حکومت نے آئی ایس آئی کو سول کنٹرول میں لانے کی ایک کمزور کوشش کی تھی لیکن اسے فوراً ہی اس فیصلے سے دستبردار ہونا پڑا۔۲۰۰۹ء میں حکومت کی بجائے فوج نے افغانستان میں نئی پالیسی کا اعلان کیا تاکہ بھارت کے ساتھ براہ راست فوجی مکالمے کا آغاز کیا جا سکے۔علاوہ ازیں پاک بھارت دوطرفہ مذاکرات کے دوران بھی فوج کی شرکت بہت واضح تھی۔سویلین حکومت کے اختیارات کا دائرہ کار ملکی سلامتی کے حقیقی معاملات کی بجائے زیادہ تر اندرونی معاملات تک محدود ہے اور یہ اختیارات بھی کئی بار اس کیلئے خطرے اور عدم استحکام کا سبب بن چکے ہیں۔ (۴۸)

مندرجہ بالا حالات کی روشنی میں ہم آئندہ چند برسوں کے بارے میں کیا اندازہ لگا سکتے ہیں؟ ذیل میں سول وفوجی تعلقات کے حوالے سے تین امکانات کا جائزہ لیا جائے گا۔

پہلا امکان، فوج کی بالادستی میں مزید اضافہ:

یہ امکان دو طریقوں سے ممکن ہو سکتا ہے، یعنی فوج براہ راست سویلین اقتدار میں مداخلت کرے یا پھر سویلین اداروں کی ٹوٹ پھوٹ (مثلاً کرپشن، نا اہلی، بد انتظامی اور دیگر انتظامی خرابیوں) کے ذریعے فوجی اختیارات میں اضافہ ہو جائے۔

☆ فوجی مداخلت کا سب سے زیادہ امکان بھارت کے ساتھ جنگ کی صورت میں ہو سکتا ہے۔بھارت کے ساتھ جنگ سے فوج کو پالیسی سازی میں اپنا کردار بڑھانے اور بعد ازاں اقتدار پر قبضے کا بہترین بہانہ مل جاتا ہے۔حتیٰ کہ ۱۹۹۹ء میں کارگل جیسی محدود جنگ نے بھی فوج کو یہ موقع فراہم کر دیا تھا، جس سے جنرل مشرف نے کارگل کے فوراً بعد فائدہ بھی اٹھایا۔

☆ تاہم پاکستان کی تاریخ بتاتی ہے کہ ملک میں فوج کے کردار اور فیصلہ سازی کی قوت میں اضافے کے ضمن میں کوئی بیرونی دھچکا بہت اہم ہو سکتا ہے۔

☆ ایک اور امکان سویلین اداروں کی ٹوٹ پھوٹ اور خرابی سے جڑا ہوا ہے، جس کے تحت اندرونی اختلافات اور خرابیوں میں اس حد تک اضافہ ہو جاتا ہے کہ ریاست اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے قابل نہیں رہتی، یوں فیصلہ سازی میں فوج کے کردار میں اضافے کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ایسے حالات و واقعات کا اندازہ لگانا زیادہ دشوار نہیں ہے۔

صوبہ پختونخواہ سے بلوچستان پھر کراچی اور اس کے بعد پنجاب میں پھیل جانے والی طالبان کی شورش ایک سویلین بیوروکریٹک ریاست پر بآسانی اثر انداز ہو سکتی ہے۔جس سے فوج کو ہر سطح کے انتظامی معاملات اپنے کنٹرول میں لینے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ معیشت کی کمزوری اور اس کے نتیجے میں ہونے والا احتجاج اور فسادات بھی سویلین اقتدار کو کمزور کر دیتے ہیں جس سے فوج کو آگے آنے اور انتظامی معاملات میں مداخلت کا جواز مل جاتا ہے، لیکن اس صورت میں فوج کی خواہش ہوتی ہے کہ سویلین رہنماؤں کو ہی ملک کی نمائندگی کے لئے پیش کیا جائے تاکہ فوجی اداروں کو عوام کی مخالفت سے بچایا جا سکے۔

فوجی بالادستی کے اس انتظام کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟ یہ ایک لمبے عرصے کیلئے براہ راست فوجی اقتدار کی شکل میں ہو سکتی ہے اور یا یہ جنرل پرویز مشرف کے دوہرے عہدے کے اقتدار کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ جس میں وہ ایک ہی وقت میں چیف آف آرمی سٹاف اور صدارت کے عہدوں پر براجمان تھے، جبکہ نمائندہ حکومت کے ادارے مثلاً قومی اور صوبائی اسمبلیاں معمولی نوعیت کے اختیارات اور فرائض کی حامل تھیں، انہیں کسی بھی اہم فیصلے یا پالیسی سازی سے الگ رکھا جاتا تھا (یہ سلسلہ آج بھی خاصا محدود ہے) جس سے یہ نظام بالادست قوتوں کی سرپرستی کا آلہ کار بن چکا تھا۔

۲۔ دوسرا امکان "سٹیٹس کو" کا جاری رہنا (حالات کا جوں کا توں جاری رہنا):

پاکستانی فوج کو حکومت کا تختہ الٹنے یا مارشل لاء لگانے کی قیمت معلوم ہے۔ اس لئے وہ اپنے مفادات کی نگرانی کیلئے دیگر طریقے بھی تلاش کرتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فوج اور آئی ایس آئی سیاسی عمل میں مداخلت کر کے اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ (سیاسی لیڈروں کی بلیک میلنگ اور ان کی نااہلیت وغیرہ کے ذریعے) فوج اور آئی ایس آئی کے نیشلسٹ ذہن کے عناصر میڈیا میں اپنے جیسے خیالات رکھنے والوں کے ذریعے صدر زرداری کو ہٹانے کی مہم کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، اور ان کی جگہ نواز شریف کو لانے کی کوشش ہوتی رہی، جنہیں یہ عناصر نظریاتی طور پر اپنا ہم خیال سمجھتے ہیں۔ لیکن ایسی صورت میں فوج نواز شریف سے بعض اہم اور حساس معاملات پر کچھ وعدے لے گی، جس میں فوجی افسروں کی ترقی کے مسئلے سے الگ رہنے جیسے اہم معاملات شامل ہیں۔

بنگلہ دیش ماڈل: سویلین شکل میں ٹیکنو کریٹ حکومت کا قیام:

بلاشبہ پاک فوج نے بنگلہ دیش ماڈل کا مشاہدہ گہری توجہ سے کیا ہے، خصوصاً ۲۰۰۷ء سے ۲۰۰۹ء کے دوران وہاں جس طرح معاملات چلائے جاتے رہے۔ سیاسی ڈیڈ لاک، بے پناہ کرپشن اور سیاسی عمل سے عوام کی عدم دلچسپی کے باعث میں بنگلہ دیشی فوج نے دو سال کیلئے ایک نگران حکومت قائم کی، تاکہ نظام میں اصلاحات کی جاسکیں اور ملک میں دوبارہ جمہوری حکومت بحال کی جاسکے۔ فوجی اصلاحات کے ذریعے قائم ہونے والی سول حکومت سے نہ صرف فوج کو عوام کا اعتماد حاصل ہوا بلکہ وہ مداخلت کے الزام سے بھی بچ گئے اور انہوں نے ملکی نظام میں اپنے

مفاد کے مطابق تبدیلیاں بھی کر لیں۔ اگرچہ بنگلہ دیش ماڈل کو بالکل اسی انداز میں پاکستان میں نافذ کرنا ممکن نہیں، تاہم پاک فوج اور تجارتی حلقے اس کی عمومی ہیئت میں کافی دلچسپی رکھتے تھے۔(۲۹) مگر پاکستان میں اس پر عملدرآمد میں کچھ مشکلات حائل تھیں۔ ایک تو پاکستان کے بااثر حلقے بھارت کی فوجی بالادستی قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے اور دوسرے وہ نہیں چاہتے تھے کہ ملکی معاملات عالمی برادری کے ذریعے چلائے جائیں جیسا کہ بنگلہ دیش میں بین الاقوامی امدادی ادارے کر رہے تھے۔

۳۔ تیسرا امکان، جمہوریت کی مضبوطی کی تحریک:

پاکستان میں سول وملٹری تعلقات کی نوعیت میں تبدیلی اور جمہوری اداروں کی مضبوطی میں مندرجہ ذیل امور زیادہ اہم ہیں۔

- ☆ فوج کی سرگرمیوں کے بارے میں سویلین نگرانی میں اضافہ۔
- ☆ انٹیلی جنس سرگرمیوں کو فوجی یا بیوروکریٹک قیادت کی بجائے منتخب قیادت کے کنٹرول میں لانا۔
- ☆ فوجی محصولات کے معاملات کو شفاف بنانا۔
- ☆ خارجہ پالیسی کے بارے میں فیصلہ سازی کو سول اداروں کے تحت لانا۔

اتنے مختصر وقت میں اتنی زیادہ تبدیلیوں کا تصور یا امید کرنا شاید بہت زیادہ ہو۔ فروری ۲۰۰۸ء میں سول حکومت کے قیام کے بعد سے اس ضمن میں کچھ زیادہ تبدیلیاں نہیں آسکیں، تاہم بعض معاملات پر اس سمت میں سفر کا آغاز ہو چکا ہے۔

سویلین طاقت میں اضافہ:

ایک قابل اور معروف سول قیادت کو کام کرنے کا مناسب موقع ملے تو اس سے فوج کے ساتھ ساتھ منتخب سیاسی قیادت اور بیوروکریسی کو پنپنے کا موقع مل سکتا ہے، یہ بظاہر ایک سست عمل ہو گا جس میں سویلین قیادت بتدریج خارجہ پالیسی اور فوجی امور پر کنٹرول حاصل کر سکے گی۔

شہری مڈل کلاس:

جمہوریت کو مضبوط بنانے کی جدوجہد میں ملک کی مڈل کلاس پیش پیش ہے۔ لیکن اس وقت یہ طبقہ ریاستی تعمیر نو میں شریک نہیں ہے۔ پاکستان کی اسی مڈل کلاس کے بارے میں کہا جاتا

ہے کہ یہ آئندہ برسوں میں بھارتی مڈل کلاس کو پیچھے چھوڑ دے گی۔ یہ مڈل کلاس (خصوصاً شہری مڈل کلاس) یوں تو نیشنلسٹ رجحان رکھتی ہے لیکن اسے تجارتی آزادیوں سے حاصل ہونے والے مالی فوائد سے بھی دلچسپی ہے۔ یہ طبقہ بھارت کے ساتھ معاشی تعلقات کی بحالی کا حامی ہے، جس سے بھارت کے ساتھ دوطرفہ تعلقات اور ملکی وسائل کی تقسیم پر گہرے اور یقینی اثرات مرتب ہوں گے۔ (۳۰)

اچانک تبدیلی:

بطور ادارہ فوج کے شکست کھا جانے کے امکانات بہت کم ہیں، جس سے فوج کی اہمیت کم ہو جائے، ملک کے سیاسی نظام کو کوئی دھچکا لگے اور سویلین قیادت کو ملک میں طاقت کا توازن تبدیل کرنے کا موقع مل جائے۔ فوج کی ایسی پسپائی بہت اہم ہوگی کیونکہ ۱۹۷۱ء میں بھارت کی مدد سے بنگلہ دیش کی تحریک آزادی میں فوج کو جس شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کے بعد بھی ملک میں فوجی و سول تعلقات کی نوعیت تبدیل نہیں ہو سکتی تھی۔

آئندہ جنگ کے اندرونی اثرات مختلف ہو سکتے ہیں، گذشتہ چالیس برسوں میں ملک میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی ہیں، اگرچہ عوام میں اب بھی بھارت کی مخالفت پائی جاتی ہے لیکن اب وہ اسے پہلے کی طرح خطرہ نہیں سمجھتے۔ اس لیے اگر اندرون ملک فوج کمزور ہوتی ہے تو لوگ بھارت کی مخالفت اور دفاعی بجٹ کے لئے مختص بھاری قوم پر سوال اٹھا سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے (اگرچہ اس کا امکان کم ہے) کہ بھارت کے ساتھ روائتی ہتھیاروں یا نچلے درجے کی نیوکلیائی جنگ کی صورت میں فوج کی اہمیت ختم ہو جائے۔ اگر مثال کے طور پر فوج ایٹمی ہتھیاروں کو دفاعی نقطہ نظر سے نصب نہیں کرتی تو اسے نہ صرف بین الاقوامی بلکہ اندرونی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ یہ صورتحال سویلین قیادت کیلئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ سول و ملٹری تعلقات کو دیگر معاملات سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا ان کا براہ راست تعلق اسی بات سے ہے کہ پاک بھارت تعلقات کیسے ہیں، جبکہ یہ افغانستان اور امریکہ کے ساتھ پاکستان کے تعلقات سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ جب تک فوج بھارتی خطرے کے تصور کو کامیابی سے پیش کرتی رہے گی یا اندرونی وہشت گردی کا خطرہ برقرار رہے گا اس وقت تک سویلین قیادت کیلئے ان معاملات میں فیصلہ سازی میں اختیار حاصل کرنا بہت مشکل ہوگا جو اس وقت فوج کے دائرہ اختیار میں ہیں۔ زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ موجودہ

صورتحال برقرار رہے گی اور فوج پس پردہ رہ کر فیصلہ کن کردار ادا کرتی رہے گی۔

قابل توجہ معاملات:

سویلین جائزہ۔ کیا پارلیمانی کمیٹیاں اس بات کی اہلیت رکھتی ہیں کہ وہ دفاعی اخراجات کی تحقیق اور پڑتال کر سکیں اور فوج کی غیر عسکری معاشی سرگرمیوں کا جائزہ لے سکیں۔

جنرل کیانی کی جگہ کون لے گا۔ مسلح افواج کے سربراہ کی حیثیت سے جنرل کیانی کی مدت ملازمت نومبر ۲۰۱۰ء تک ہے۔ (اس میں ۲۰۱۳ء تک کی توسیع ہو چکی ہے) پاکستانی طالبان کے خلاف فوجی کارروائیوں اور پاک امریکہ تعلقات کا بڑا انحصار اس بات پر ہے کہ جنرل کیانی کی جگہ لینے والے جنرل کا ویژن اور طریقہ کار کیا ہے۔

امن کے عمل میں فوج کی شرکت۔ کیا فوج پاک بھارت دوطرفہ مذاکرات میں کھلم کھلا کوئی کردار ادا کرے گی؟ اس صورت میں یہ دونوں ملکوں کی افواج کے درمیان کسی گفتگو کی عدم موجودگی میں ایک اہم قدم ہوگا۔

نیشنل سیکورٹی کونسل (NSC)، کیا سول حکومت فیصلہ سازی کا ایسا طریقہ کار وضع کر سکے گی جس میں فوج کی قیادت کو ساتھ ملا کر سویلین بالادستی قائم کی جا سکے۔ نیشنل سیکورٹی کونسل کی شکل میں ایسا طریقہ کار وضع کیا جا سکتا تھا لیکن وہ ممکن نہیں ہو سکا۔ اس ادارے کا فائدہ یہ ہوتا کہ اس میں فوجی اور سول قیادت اکٹھی ہو جاتی اور فوج تنہا فیصلہ سازی نہ کر پاتی۔

سول قیادت میں انتہاپسندوں کے خلاف کارروائی: کیا سول قیادت اسی بات سے فائدہ اٹھا سکے گی کہ وہ اندرون ملک انتہا پسند تنظیموں مثلاً لشکر طیبہ (LeT) اور فرقہ وار گروہوں کے خلاف کارروائی کیلئے فوج کی رہنمائی کر رہی ہے۔

رائے شماری (پولنگ) گیلپ پاکستان اور آئی آر آئی (IRI) کے بار بار منعقدہ رائے عامہ کے جائزوں کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عوام نے سول قیادت، سیاسی اپوزیشن اور فوج کے فیصلوں کو قبول کیا ہے۔

باب 3

اسلامائیزیشن کے رجحانات

مغرب میں پاکستانی پالیسی کا تجزیہ کرنے والوں میں ان دنوں اس خوف اور تشویش کا اظہار کیا جارہا ہے کہ پاکستانی ریاست کے طالبان یا دیگر اسلامی شدت پسندوں کے قبضے میں جانے کے امکانات بہت زیادہ ہو گئے ہیں ۔اس صورت میں نہ صرف اس علاقے کے حالات خراب ہوں گے، خصوصاً بھارت کے جہاں ایک بڑی مسلم اقلیت موجود ہے، بلکہ اس سے عالمی دہشت گرد پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں تک رسائی میں بھی کامیاب ہو سکتے ہیں ۔تاہم اس رپورٹ میں اس امکان کو مسترد کیا گیا ہے، خاص طور پر آئندہ چند برسوں میں اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ پاکستان میں طاقت کے مراکز میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع ہوجائے ۔تاہم اس بات کا امکان موجود ہے کہ اس عرصے میں مذہبی گروہ پاکستانی معاشرے میں بدستور اہم اور ہمہ جہت کردار ادا کرتے رہیں۔

ملکی سیاست میں مذہبی جماعتوں کے غلبے کا کوئی امکان نہیں:

پاکستان میں دو بڑی مذہبی جماعتیں ہیں ۔ جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے اسلام، جے یو آئی ۔ جماعت اسلامی جدید روایات کو مشرق وسطیٰ میں مسلم بھائی چارے کی مہم کے گہرے نظریاتی رشتوں کے ساتھ ملا کر کام کرتی ہے ۔ یہ موجودہ غیر مذہبی حکومتوں کو اسلام اور اسلامی قانون کی حکمرانی سے تبدیل کرنے کیلئے کام اور جدوجہد کر رہی ہے ۔ جماعت اسلامی شدت

پسند نظریاتی جماعت ہے، یہ سیاسی طور پر بہت منظم ہے اور اس کی جڑیں شہری مڈل کلاس میں ہیں ۔فرقہ واریت سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں ۔انتخابات میں جماعت اسلامی نے کبھی بھی گیارہ فیصد سے زائد ووٹ حاصل نہیں کیے ۔ریاست کے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں لانا جماعت کی پرانی پالیسی اور سوچ ہے ۔خارجہ پالیسی کے معاملے میں اس کی توجہ بھارت اور مسئلہ کشمیر کے علاوہ عالمی معاملات پر بھی ہے، اس کے برطانیہ میں بھی گہرے رشتے ہیں اور براعظم یورپ میں بھی اس کے تعلقات بڑھ رہے ہیں ۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جماعت اسلامی کے القاعدہ سمیت دیگر کثیر ملکی اسلامی تنظیموں کے ساتھ غیر رسمی مگر قابل تردید تعلقات ہیں ۔[۳۰] بعض ماہرین کا خیال ہے کہ چونکہ ۲۰۰۱ء کے بعد القاعدہ کے متعدد ارکان جماعت اسلامی کے مراکز اور اس کے ارکان کے گھروں سے گرفتار ہوئے ہیں اس لیے دونوں کے تعلق کی بات میں کافی وزن ہے ۔اس کے علاوہ نظریاتی سوچ اور سماجی رشتوں کے حوالے سے بھی دونوں گروپوں میں خاصی مماثلت ہے تاہم تشدد کے حوالے سے ان کے خیالات یکساں نہیں ہیں ۔

دوسری بڑی مذہبی جماعت جمعیت علمائے اسلام ہے اور خصوصاً اس کا وہ دھڑا جو جے یو آئی ایف کہلاتا ہے ۔(جو مولانا فضل الرحمٰن کی سربراہی میں کام کرتا ہے) یہ جماعت ہندوستان پر برطانیہ کے قبضے کے دس سال بعد ۱۸۶۷ء میں دیوبندی فرقہ کی بحالی کی تحریک کے طور پر شمالی ہندوستان میں وجود میں آئی ۔[۳۱] صوبہ سرحد کے پشتون علاقوں اور کراچی کے بعض حصوں میں اس کی گہری جڑیں ہیں ۔[۳۲] جماعت اسلامی کی نظریاتی شدت پسندی کے برعکس جے یو آئی محض ایک مذہبی تنظیم ہے جو اپنے مدرسوں اور ان کے مفادات کے تحفظ پر زیادہ توجہ دیتی ہے ۔خارجہ معاملات میں بھی اس کی توجہ بھارت کی بجائے افغانستان پر مرکوز ہے ۔غیرت اور صنفی معاملات سے متعلق پشتون قبائلی سماجی روایات سے اس جماعت کی گہری وابستگی ہے ۔بطور جماعت جے یو آئی غیر منظم، مرکزیت سے پاک اور دھڑے بندی کا شکار ہونے کے باوجود حیرت انگیز طور پر معقول رویے کی حامل ہے ۔یہ ایک ایسی جماعت ہے جو پاکستان کو ایک عظیم اسلامی ریاست بنانے سے زیادہ مدرسوں کے بارے میں سرکاری کارروائیوں، امداد اور فوائد کے حصول کے بارے میں فکرمند رہتی ہے ۔مغربی دنیا میں اس کا پہلا تعارف نوے کی دہائی کے وسط میں اس وقت ہوا جب یہ جماعت افغان طالبان کے ایک غیر رسمی نمائندے کے طور پر سامنے آئی ۔

طالبان اور اسی نوعیت کے دیگر گروپوں سے اس کے تعلقات آج بھی ہیں، مگر زیادہ تر نچلی سطح تک محدود ہیں۔

اگرچہ جماعت اسلامی اور جے یو آئی پاکستان میں مذہبی جماعتوں کے منظر میں نمایاں حیثیت کی حامل ہیں، لیکن انتخابات میں ان کا اتحاد یا مشترکہ شراکت بھی ملک میں کوئی بڑی تبدیلی لانے سے قاصر ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں کسی بھی موقع پر مذہبی جماعتوں نے قومی اسمبلی میں انیس فیصد سے زائد نشستیں حاصل نہیں کیں اور ان کے حاصل کردہ ووٹوں کا تناسب اس سے بھی کم رہا ہے۔ صوبائی اسمبلیوں میں بھی ان جماعتوں کو کبھی کوئی خاص کامیابی نہیں ملی، سوائے ایک موقع کے جب ۲۰۰۲ء میں صوبہ سرحد کی اسمبلی کے انتہائی مشکوک انتخابات میں مذہبی جماعتوں کے اتحاد نے اسمبلی کی نصف سے زائد نشستیں حاصل کر لیں۔ (۴۳)

مستقبل قریب میں بھی مذہبی جماعتوں کے ووٹوں کی تعداد میں اضافے کی کوئی توقع نہیں۔ جے یو آئی کی انتخابی سیاست کو محدود کرنے والے عناصر کا تعلق اس کی پالیسی سے زیادہ ملک کے سیاسی ڈھانچے سے ہے جو مندرجہ ذیل ہیں

☆ نواز شریف کی قیادت میں پاکستان مسلم لیگ (ن) جیسی جماعت کا وجود، جو دائیں بازو کی ایک بڑی اور قابل اعتبار پارٹی سمجھی جاتی ہے۔

☆ پشتون رہنماؤں اور لسانی روایات سے جے یو آئی کا گہرا تعلق۔

☆ مدرسوں پر انحصار کرنے کی پالیسی

دوسری جانب جماعت اسلامی کو ملنے والے ووٹوں کی تعداد میں اضافے کے امکانات کافی زیادہ ہیں کیونکہ ایک تو اس کی پالیسی کافی کھلی ہے اور اس کا مسلم بھائی چارے کی مہم کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے، دوسری اہم بات یہ کہ یہ جماعت کسی خاص علاقے یا لسانی گروہ تک محدود نہیں ہے۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ یہ نئے لسانی اور نسلی گروہوں کی حمایت حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن جماعت اسلامی کو بھی اپنے مخصوص کردار سے باہر نکل کر پاکستانی پارٹی سسٹم میں کام کرنے میں مشکلات کا سامنا ہے۔ اگرچہ اس نے بار بار ثابت کیا ہے کہ وہ اسلام اور قومی سلامتی کے موضوعات کو عوامی بحث و مباحثے کا موضوع بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن یہ عوام کی اکثریت کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ جماعت اسلامی میں شمولیت کیلئے گہری نظریاتی وابستگی کی ضرورت ہوتی

ہے۔ اس لیے اس کے متعدد حامی اس کی بجائے دائیں بازو کی دیگر جماعتوں مثلاً مسلم لیگ ن میں شمولیت اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ نہ صرف انتخابات میں اس کی کامیابی کے امکانات روشن ہوتے ہیں بلکہ اس میں شمولیت سے مالی و سرکاری فوائد کا حصول بھی ممکن ہے۔ مختصراً یہ کہ پاکستان کے سیاسی منظر نامے میں مذہبی جماعتوں کی اہمیت کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتی رہتی ہے لیکن ابھی تک ایسا کوئی امکان نہیں کہ یہ جماعتیں ریاست یا حکومت پر قبضہ کر لیں۔

ملک پر طالبان کے قبضے کا کوئی امکان نہیں:

حالیہ عرصے میں اس بات پر خاصی تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ سرحدی علاقوں سے لے کر بڑے شہروں مثلاً لاہور اور اسلام آباد تک طالبان کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کا جائزہ اگلے حصے میں لیا جائے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ آئندہ کئی برسوں تک طالبان کا وجود نظریاتی اور عملی اعتبار سے پاکستان کی سلامتی کیلئے ایک حقیقی خطرہ ہے۔ انہوں نے کئی علاقوں پر قبضہ کر رکھا ہے اور ابھی تک ریاست ان سے ان علاقوں کا قبضہ واپس نہیں لے سکی۔ تاہم پاکستانی طالبان ابھی تک بجائے خود ریاست کیلئے خطرہ نہیں بنے۔

دراصل پاکستان پر طالبان کے قبضے کے خطرے کو اس شبہے کے تحت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے کہ فوج اور سیاست کے بالائی طبقات طالبان کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ (۴۴) اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ عوام میں طالبان کے امریکہ مخالف ایجنڈے کی حمایت پائی جاتی ہے، مگر اس صورت میں بھی چند ہزار طالبان اتنی قوت نہیں رکھتے کہ ایک بڑی اور طاقتور فوج کی موجودگی میں ملک پر قبضہ کر لیں، یوں بھی عمومی طور پر وہ عوام میں زیادہ مقبول نہیں ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ طالبان کچھ علاقوں پر قبضہ نہیں کر سکتے یا حکومت کے ساتھ لین دین کی پوزیشن میں نہیں۔ وہ نہ صرف اپنے لئے مراعات حاصل کرتے رہتے ہیں بلکہ اسلام آباد اور لاہور میں اہم مقامات پر حملے بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس بات کے بھی بے شمار ثبوت موجود ہیں کہ اعلیٰ فوجی قیادت نے طالبان اور اس طرح کے دیگر شدت پسند گروپوں کو افغانستان اور کشمیر میں سیاسی فوائد حاصل کرنے کیلئے استعمال کیا اور شاید یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا، مگر

اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ ملک کے یہ طاقتور طبقات طالبان کو حقیقی اقتدار منتقل کردیں گے۔ اگرچہ مذہبی جماعتیں سیاسی طور پر حاوی ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہیں لیکن وہ کئی اور طریقوں سے ریاست کی سلامتی کیلئے خطرہ ہیں۔

۱۔اسلامائزیشن کا دباؤ:

یہ دباؤ زیادہ تر براہ راست انتخابات میں مذہبی جماعتوں کی کامیابی کی بجائے بالواسطہ ہوتا ہے۔جس میں یہ جماعتیں کسی بڑے سیاسی اتحاد میں شامل ہوکر اسلامائیزیشن کے لئے دباؤ ڈالتی ہیں۔ان کا یہ دباؤ عام طور پر ملک کے نسبتاً آزاد اور برداشت کے اصولوں پر مبنی نظام انصاف کیلئے خطرہ بنتا ہے۔یہ نظام زیادہ تر برطانوی دور کے قوانین سے مل کر بنا ہے۔ان کے اس دباؤ کا یہ خطرہ خاصا شدید ہے کیونکہ ملک کا قانونی نظام خاصا سست،بدعنوان اور ناانصافی پر مبنی ہے جو ملک کے غریب اور نچلے طبقے کو کوئی رعایت نہیں دیتا۔قانونی نظام کے مسائل سے واقف بے بس شہریوں کے لئے شرعی قوانین خاصا پرکشش متبادل نظام ہے۔(۳۶)

اتحادی جماعتوں میں شمولیت سے فائدہ اٹھانے والی مذہبی جماعتیں درج ذیل اقدامات پر زور دیتی ہیں۔

- ☆ شرعی عدالتوں کے دائرہ کار میں اضافہ،خصوصاً فیملی لاز اور وراثتی قوانین کے ضمن میں۔
- ☆ شرعی تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے بینکنگ قوانین میں معمولی تبدیلیاں۔
- ☆ خواتین کے حقوق اور معاشرتی منظر پر ان کی موجودگی کے بارے میں قوانین میں تبدیلیاں۔
- ☆ پرہیزگاری اور مذہبی رسوم ورواج کے مظاہروں میں اضافہ
- ☆ مذہبی اقلیتوں مثلاً احمدیوں،عیسائیوں اور کسی حد تک شیعہ فرقے سے متعلق قوانین میں تبدیلیاں کرکے ان لوگوں کو مزید کمزور بنانا۔

توہین رسالت کے قانون کی منسوخی میں مزید تاخیر:

اوپر دیئے گئے آخری نکتے کی مزید وضاحت کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ عوام میں دائیں بازو کے رجحانات میں اضافے کے سبب اقلیتوں خصوصاً احمدیوں،عیسائیوں،سکھوں اور ہندوؤں

پر خاصا برا اثر پڑا ہے۔احمدی کئی دہائیوں سے سرکاری طور پر امتیازی سلوک کا شکار ہیں،ان کے خلاف بدسلوکی کا آغاز عام طور پر مذہبی جماعتوں کی جانب سے ہوتا ہے اور پھر یہ رویہ اقلیتوں کے خلاف سرکاری طور پر امتیازی سلوک کی رہنمائی کرنے لگتا ہے۔عیسائی اقلیت بھی حال ہی میں تشدد کا نشانہ بنی ہے۔ایسے واقعات خاص طور پر صوبہ پنجاب میں زیادہ ہوئے ہیں۔عیسائیوں کو متعدد بار توہین رسالت کے قانون کے تحت متشدد گروہوں کے حملوں اور الزامات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔اس قانون کو کمزور طبقوں کے خلاف سیاسی ہتھیار کے طور پر بآسانی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اگست ۲۰۰۹ء میں پنجاب کے شہر گوجرہ میں عیسائی اقلیت کے قتل عام کے واقعہ کے بعد اس قانون میں تبدیلی اور اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنے کے مطالبات سامنے آئے ہیں،لیکن ایسی تمام کوششوں کو مذہبی جماعتوں اور مسلم لیگ ن کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔اگر ملک کی رائے عامہ میں قدامت پسندی اور قوم پرستی کے رجحانات مسلسل بڑھتے رہے تو اس بات کا واضح امکان ہے کہ ملک میں اقلیتوں کی جانب عدم برداشت میں مزید اضافہ ہوجائے گا۔

۲۔مذہبی گروپوں کو برداشت کرنے کا دباؤ:

مذہبی یا اسلامی گروپوں کو روکنے اور ان پر کنٹرول حاصل کرنے کی راہ میں ایک اہم رکاوٹ یہ ہے کہ مذہبی جماعتیں مدرسوں سے لے کر طالبان تک کسی بھی ایسے گروپ یا تنظیم کے خلاف فوجی یا پولیس کارروائی کی شدت سے مخالفت کرتی ہیں جس کا مذہب سے کوئی بھی تعلق ہو۔ مخلوط حکومتوں میں مذہبی جماعتوں کی موجودگی کے سبب ریاست اور حکومت پر مسلسل یہ دباؤ رہتا ہے کہ وہ ایسے مذہبی گروہوں اور اسلامی تنظیموں کو کام کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے جو نہ صرف ریاست کی رٹ اور اتھارٹی کو مسلسل چیلنج کرتے اور مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہوتے ہیں بلکہ انصاف کا اپنا نظام نافذ کرنے اور قدامت پسند منفی روایات نافذ کرنے پر بھی اصرار کرتے ہیں۔امریکی نقطہ نظر سے بھی ملک میں اسلامی جماعتوں کا یہ اثر ورسوخ بہت سی مشکلات کا سبب بن سکتا ہے اور اس سے ملک کی فوجی و بیوروکریٹک قیادت کو ان گروپوں کے خلاف فیصلہ کن کارروائی میں مشکل پیش آتی ہے،جو علاقائی مثلاً کشمیر اور عالمی جہادی پس منظر میں کام کرتے ہیں۔

۳۔امریکی تعاون کو مسترد کرنے کا دباؤ:

مذہبی جماعتوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کے سبب رائے عامہ کے اس مقبول نعرے کو بہت ہوا ملتی ہے کہ پاک امریکہ تعلقات ختم کر دیے جائیں۔مذہبی جماعتیں امریکہ کی مخالفت پر مبنی بیانات عام طور پر اپنی سیاسی پوزیشن بہتر بنانے کیلئے دیتی ہیں، لیکن یہ رویہ لامحدود مدت تک اپنایا نہیں جا سکتا، کیونکہ اگر مذہبی گروہوں کی تلخی کے سبب امریکہ یہاں سے چلا جاتا ہے تو حالات زیادہ خراب ہو سکتے ہیں۔اگر چہ اس بات کا زیادہ امکان نہیں لیکن اگر ایک ممکنہ صورت میں بھارت اور افغانستان مل کر پاکستان کے خلاف کارروائی کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں امریکہ کی ہمدردیاں بھی پاکستان کے ساتھ نہیں ہوں گی۔تاہم جس بات کا زیادہ امکان ہے وہ یہ ہے کہ مذہبی جماعتوں کے آپسی تعاون اور حکومت پر ان کے دباؤ میں اضافہ ہوگا کہ امریکہ کے ساتھ تعاون کا خاتمہ کیا جائے۔آئندہ وقت میں یہی رجحان نظر آرہا ہے۔

بنیاد پرست گروہوں کا خطرہ:

(عوامی شکایات کی شنوائی) پاکستانی ریاست کو قدامت پسند گروہوں سے اس نوعیت کے خطرے کا سامنا نہیں ہے جیسے خطرے کا سامنا مغربی ممالک کو القاعدہ کی جانب سے ہے۔ پاکستان کو حقیقی خطرہ کسی بیرونی قوت کی جانب سے انتشار کی بجائے مذہبی سیاسی جماعتوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کے باعث ہے۔یہ مذہبی سیاسی جماعتیں ریاست سے ناخوش ہیں اور ان کی وجہ سے پاکستان بتدریج امریکہ اور برطانیہ کے مفادات سے لاتعلقی اختیار کر رہا ہے، اور پاکستانی حکومت میں عوامی طور پر مغربی ممالک کے ساتھ کام کرنے کی گنجائش کم ہو رہی ہے۔

ان قدامت پسند گروپوں میں وہ گروپ زیادہ مشکلات پیدا کر رہے ہیں جو بظاہر عوامی مشکلات کے خاتمے کیلئے سیاسی عمل کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔مقامی حکومت اور سرکاری اداروں کی کارکردگی میں مسلسل تنزلی کے سبب ایسی تنظیموں کے لیے راستہ مزید ہموار ہو جاتا ہے اور وہ اس طریقے سے ریاست کے سامنے عوام کی نمائندگی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ان کا یہ بڑھتا ہوا اثر ورسوخ آہستہ آہستہ انہیں بڑے شہروں اور میڈیا کے اہم لوگوں تک بھی رسائی فراہم کر دیتا ہے۔

مذہبی گروپوں کی مضبوطی کا خطرہ:

پاکستان میں مذہبی اسلامی گروپوں کے مضبوط ہونے کا کافی خطرہ ہے۔صوبہ سرحد میں طالبان کا اتحاد جسے تحریک طالبان پاکستان (TTP) کہا جاتا ہے، وہ پاکستان، امریکہ اور برطانیہ کیلئے خاصی مشکلات پیدا کر رہے ہیں، پاکستانی علاقوں میں موجود ان طالبان نے مختلف علاقوں میں مشترکہ کارروائیاں کر کے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا ہے۔

منتشر اور آزاد اسلامی گروپوں کا خطرہ:

مختلف مذہبی تنظیموں میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ کے نتیجے میں بننے والے مقامی اتحادوں سے بھی پاکستان کو متعدد خطرات کا سامنا ہے۔نئے نئے گروپوں کی وجہ سے ریاست کیلئے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کونسا گروپ مذاکرات کیلئے قابل اعتبار ہے، نیز یہ کہ ریاست اپنی قوت کو ان گروہوں کے خلاف کس طرح موثر انداز میں استعمال کرے۔اگر ریاست کسی ایک دھڑے کے ساتھ بات چیت میں کچھ امور طے کر لیتی ہے تو یہ فائدہ اس تنظیم کے کسی اور خفیہ یا زیر زمین دھڑے کے سبب ضائع ہو جاتا ہے۔(۳۷)

ان گروہوں کی ٹوٹ پھوٹ کا ایک اور نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس سے ان انتہا پسند دھڑوں کو فسادات یا امن وامان سے محروم کسی متاثرہ علاقے میں اکٹھے ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ ۲۰۰۸ء اور ۲۰۰۹ء میں صوبہ سرحد کے متعدد علاقے ایسے لوگوں کی پناہ گاہ بن گئے اور وہ مختلف علاقوں سے وہاں اکٹھے ہو گئے۔ان میں مندرجہ ذیل گروپ اہم ہیں۔

- ☆ کشمیر سے تعلق رکھنے والے سابقہ اور موجودہ پنجابی گروپ
- ☆ شیعہ فرقے کے خلاف کام کرنیوالی فرقہ پرست تنظیمیں
- ☆ القاعدہ سے تعلق رکھنے والے عرب اور چیچن باشندے
- ☆ مقامی قبیلوں سے تعلق رکھنے والے طالبان کمانڈر
- ☆ مختلف مذہبی جماعتوں مثلاً جماعت اسلامی کی خدمت خلق کی تنظیمیں۔

حکومت کو ریاست کے خلاف کام کرنیوالی ان الگ الگ تنظیموں کے ساتھ معاملات طے کرنے میں سخت مشکلات کا سامنا ہے، اور آئندہ تین برسوں میں اس نوعیت کے فری سٹائل اور

تاجرانہ رجحانات میں کمی کا بھی کوئی امکان نہیں ہے۔

قابلِ غور امور:

سب سے پہلی اہم بات غیر سیاسی مذہبی تنظیموں کا حیرت انگیز طور پر مہربان اور اچھا رویہ ہے۔تبلیغی جماعت کی مثال دیکھئے۔۱۹۲۱ء میں ہندوستان سے تعلق رکھنے والی دیوبندی مکتبِ فکر کی یہ جماعت کثیر ملکی روابط رکھتی ہے۔تبلیغی جماعت کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ یہ لوگ غیر سیاسی طور پر مذہب،مذہبی رسم و رواج اور نیکی کا درس دیتے ہیں۔لیکن یہ جماعت اپنے عظیم الشان جلسوں میں سیاسی مقاصد رکھنے والی مختلف مذہبی گروپوں کی میزبانی کرتی ہے اور یوں انہیں بالواسطہ طور پر فائدہ پہنچاتی ہے۔لاہور کے نواح میں رائے ونڈ کے مقام پر ان کے سالانہ اجتماع میں ان کے لاکھوں معتقد شرکت کرتے ہیں اور تجزیہ نگاروں کو شبہ ہے کہ اس تنظیم کے بین الاقوامی مشنری نیٹ ورک میں اکثر ایسے انتہا پسند گروپ شامل ہو جاتے ہیں جو اسلامی دنیا میں اس کے نام سے فائدہ اٹھا کر اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔تبلیغی جماعت اور دیوبندی فرقے کی تنظیموں نے اپنے جلسوں میں کئی بار مسلح گروپوں کو رکنیت سازی کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس جماعت نے پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور خلیجی ریاستوں کی اسلامی تنظیموں کے باہمی روابط بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ملک کے اندر بھی اس جماعت کا کردار خاصا اہم ہے۔تبلیغی جماعت نے ملک کی مڈل کلاس میں اپنے غیر سیاسی اسلامی فلسفے کو کامیابی سے پیش کیا ہے۔اگرچہ ملک کے سیکولر طبقے اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن مڈل کلاس پروفیشنل اور سرکاری و فوجی افسروں میں اس کا خاصا احترام کیا جاتا ہے۔

۲۰۰۹ء کے اوائل میں تبلیغی جماعت سے متعلق ایک اچھی خبر سامنے آئی جب انہوں نے طالبان کے خلاف بندوق کے زور پر شریعت نافذ کرنے کے خلاف بیان جاری کیا، حالانکہ وہ عام طور پر سیاسی بیانات سے گریز کرتے ہیں۔(۳۸) لیکن بڑے شہروں میں طالبان کے پھیلاؤ نے تبلیغی جماعت کو واضح پریشانی میں مبتلا کر دیا۔اس بات کا جائزہ بہت ضروری ہے کہ تبلیغی جماعت اور اس جیسے دیگر گروہ القاعدہ اور طالبان کیلئے کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ

جماعت رائے عامہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔خاص طور پر مذہبی فرائض کی ادائیگی اور متشدد رویوں کے درمیان فیصلہ نہ کر پانے والے لوگوں کیلئے اس جماعت کی بہت اہمیت ہے۔ ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے دیوبندی فرقے کے افراد نے پاکستان میں ہونے والے حالیہ خودکش دھماکوں کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا لیکن بھارت کے دیوبندی فرقے کی جانب سے اس کی مخالفت کی گئی ہے۔

دوسری اہم اور قابلِ غور بات تشدد پسندوں اور غیر سیاسی مذہبی گروپوں کا انتہا پسندی (حماس کے انداز) کی جانب مسلسل متوجہ ہونا ہے۔

غیر سیاسی مذہبی گروہوں مثلاً اسلامی ویلفیئر ٹرسٹ، تعلیمی اداروں اور خالصتاً دینی تحریکوں کے پاس ریاست مخالف قدامت پسند گروپوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے کی کئی اہم وجوہات ہیں۔۲۰۰۷ء میں اسلام آباد کی لال مسجد پر شدت پسندوں کا قبضہ ایسی ہی ایک مثال ہے، جس میں بظاہر ایک غیر سیاسی ادارے یعنی لال مسجد اور ملحقہ مدرسے سے وابستہ افراد جیش محمد اور لشکر جھنگوی جیسے ریاست مخالف عناصر کے ساتھ مل گئے تھے۔(۳۹)

جس طرح غیر سیاسی تنظیمیں شدت پسندوں کے ساتھ رابطے کر رہی ہیں، اسی طرح خود شدت پسند بھی فلاحی و تعلیمی ادارے بنانے میں مصروف ہیں۔یعنی تنظیم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے کہ ایک حصہ شدت پسند کارروائیوں میں مصروف ہو اور دوسرا عوامی خدمت کر رہا ہو تو اس سے تنظیم کو فائدہ پہنچتا ہے اور یہ فلاحی کام ان تنظیموں کیلئے نہ صرف عوامی حمایت حاصل کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں بلکہ ریاست کیلئے ان گروپوں کا مکمل خاتمہ بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ان تنظیموں کے یہ ذیلی ادارے ان کے لئے اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

آئندہ چند برسوں میں یہ سوال بھی اٹھے گا کہ کیا پاکستانی طالبان شرعی عدالتوں کے ذریعے عوام کو انصاف کی فراہمی اور لوگوں کو متاثر کرنے والے دیگر کام اور خدمات فراہم کر رہے ہوں گے، اور کیا سوات جیسے علاقوں میں فوجی آپریشن کے خاتمے کے بعد ایسے گروپ اپنی فلاحی سرگرمیوں کے ذریعے اپنی موجودگی برقرار رکھ پائیں گے۔

تیسری اہم اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ رائے عامہ حکومت اور فوج کے ساتھ ہوگی یا وہ طالبان کی حمایت کرے گی۔۲۰۰۹ء کے موسم بہار میں پاکستانی رائے عامہ میں ایک حیرت انگیز

تبدیلی دیکھنے میں آئی اور عوام شدت پسندی کے مسئلے کے حل کیلئے حکومت کے حق میں ہو گئے، یہ تبدیلی اسلام آباد سے ساٹھ میل کے فاصلے پر واقع ضلع بونیر میں طالبان کی کارروائیوں اور پنجاب میں ہونے والے خودکش حملوں کی وجہ سے ممکن ہوئی۔ حتیٰ کہ نواز شریف کی قیادت میں کام کرنے والی مسلم لیگ ن نے بھی شدت پسندی کے خلاف حکومت کی پالیسی کے حق میں بیانات دیئے۔ اگرچہ حکومت کے پاس شدت پسندوں کے خلاف پالیسیاں بنانے کیلئے رائے عامہ میں تبدیلی ہی سب سے بڑی وجہ نہیں تھی تاہم اس سے سویلین حکومت کو مشکل فیصلے کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

چوتھی اہم بات مذہبی گروپوں کی جانب سے قوانین کو اپنے حق میں استعمال کرنا ہے۔ اگر موجودہ لبرل حکومت اقلیتوں اور خواتین کے بارے میں قوانین میں اصلاحات کا فیصلہ کرتی ہے تو اسے مذہبی سیاسی جماعتوں اور اسلامی گروپوں کی جانب سے سخت ردعمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایسی صورت میں وہ نہ صرف موجودہ نام نہاد اسلامی قوانین کا سہارا لیں گے بلکہ اقلیتوں کو حاصل موجود آزادی کو بھی نشانہ بنائیں گے۔ مذہبی گروپوں کی یہ طاقت اس وقت ریاستی بیوروکریسی کے رویے پر بھی اثر انداز ہوتی ہے جب وہ ان تنظیموں کی جانب سے انصاف فراہم کرنے کیلئے کئے گئے تشدد کے واقعات کا نوٹس لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ گروپ پاکستان کے مغربی ممالک خصوصاً امریکہ کے ساتھ تعلقات کے بارے میں رائے عامہ کی تشکیل میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ ملکی آئین اور سیاست میں ان تنظیموں کے اثر ورسوخ کو کم کرنے کے طریقے وضع کئے گئے ہیں لیکن ان کے زیر اثر سیاسی وسماجی ضابطے ریاست کو بتدریج ایک نسبتاً مذہبی ریاست میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ دراصل یہ تبدیلی ملک کی طاقتور فوجی بیوروکریسی کے مفادات کو پورا کرتی ہے، کیونکہ ملک کو ایک مذہبی شناخت دینا ان کی ایک مستقل ضرورت ہے۔

مختصراً یہ کہ اگرچہ پاکستان میں قدامت پسند اسلام ایک کامیاب سیاسی قوت کے طور پر کامیاب نہیں ہو سکتا جو ملک کی فوجی طاقت کو چیلنج کر سکے تاہم اس میں اتنی گنجائش ضرور موجود ہے کہ ماضی کی طرح موجودہ مذہبی سیاسی جماعتیں اور دیگر اسلامی گروپ ملک میں نام نہاد اسلامی قدروں کے نفاذ میں اضافہ کر سکیں۔ اس نوعیت کی اصلاحات کے نفاذ کیلئے ریاست پر دباؤ ڈالنے کیلئے گاہے بگاہے تشدد کا حربہ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اس بات کے امکانات بہت زیادہ

ہیں کہ ملک میں موجود مذہبی گروپوں میں مزید ٹوٹ پھوٹ ہو گی اور ان کے تجارتی (لین دین) مقاصد میں اضافہ ہو گا۔ قوانین وضابطوں سے آزاد ایسے مذہبی گروہوں کے سامنے آنے سے ریاست کیلئے ان پر قابو پانا سخت مشکل ہو گا کیونکہ وہ نہ تو کسی بڑی مذہبی جماعت یا مدرسے سے تعلق رکھتے ہوں گے اور نہ ہی کسی قانون پر چلنے پر آمادہ ہوں گے۔

☆☆☆

باب 4
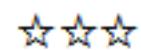
پشتون قوم پرستی کا مستقبل

پاکستان کی شمالی مشرقی سرحد، صوبہ سرحد اور وفاق کے زیر اہتمام آزاد قبائلی علاقے فاٹا (FATA) پر مشتمل ہے۔ جو ملک کا سب سے شورش زدہ اور خطرناک علاقہ ہے۔ یہاں پشتو بولنے والوں کی اکثریت ہے اور یہ سرحدی علاقہ متنازعہ سیاست اور ریاست مخالف جہادی تنظیموں کی ایک طویل تاریخ رکھتا ہے۔ حالیہ برسوں میں یہ علاقے القاعدہ اور اس نوعیت کے دیگر کثیر قومی روابط رکھنے والے دہشت گردوں کیلئے ایک محفوظ جنت بن چکے ہیں۔

عالمی برادری میں پاکستان کے ایک ناکام ریاست بننے کا خدشہ اس تشویش کی بنا پر کیا جا رہا ہے کہ یہ ملک نسلی ولسانی بنیادوں پر ٹکڑے ٹکڑے ہونے والا ہے جس سے ریاست جغرافیائی طور پر کمزور اور مختصر ہو جائے گی۔ اس تشویش کا ایک سبب بلوچستان میں پائی جانے والی بے چینی ہے، جہاں فوج کئی دہائیوں سے قبائلی جھگڑوں میں الجھی ہوئی ہے۔ (۴۰) تاہم عالمی برادری کی جانب سے ملک کے ٹکڑے ہونے کے خدشے کی وجہ زیادہ تر سرحد اور فاٹا کے پشتو بولنے علاقوں کے حالات ہے۔

صوبہ سرحد میں پشتون قوم پرستی کی ایک قدیم اور زبردست تاریخ ہے۔ اس پشتو آئیڈیل کی نشوونما پشتو زبان اور شاعری کی روایات کے ساتھ ساتھ برطانوی دور کی تحریروں سے ہوئی، جن میں ان قبائلیوں کو بلند کردار، بے حد غیرت مند اور اپنے آباؤاجداد کی سرزمین کے ساتھ بہت شدت سے منسلک دکھایا گیا ہے، پشتونوں کے اس تصور کو برطانوی دور میں ایک مخصوص رنگ میں

رنگ دیا گیا، لیکن بیسویں صدی کے تمام پشتون رہنما اسی تصور سے متاثر ہوئے، اور اسی کے تحت ۱۹۲۰ء اور ۳۰ء کی دہائیوں میں خان عبدالغفار خان (جو سرحدی گاندھی کے نام سے بھی مشہور ہیں) نے برطانیہ کے خلاف ایک غیر متشدد تحریک کی قیادت کی۔ موجودہ دور میں غفار خان کی یہ تحریک پشتون قومیت کیلئے کام کرنے والی تمام قوم پرست جماعتوں کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد سے مرکزی حکومت پشتون نیشنل ازم میں اضافے سے سخت پریشان رہی ہے۔ ۱۹۷۰ء تک پشتون قوم پرستوں کی نئی نسل نہ صرف برطانیہ کی بنائی ہوئی سرحد (ڈیورنڈ لائن) کے خلاف تھی۔ جسے پاکستان ایک جائز اور بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ سرحد تصور کرتا ہے بلکہ انہوں نے بائیں بازو کے نظریات سے بڑی گہری وابستگی پیدا کر لی اور کابل کے ان سیاسی حلقوں سے قریبی تعلقات استوار کر لئے جو بھارت کی حمایت کرتے تھے۔ قدرتی طور پر پاکستان کے بالائی طبقے میں اس بات سے سخت تشویش پیدا ہوئی کہ کہیں ان تعلقات سے سرحد کے دونوں جانب ایک نئے گریٹر پشتونستان کی جانب پیش رفت نہ ہونے لگے۔

کیا خطرہ حقیقی ہے؟

آئندہ برسوں میں پشتون نیشنل ازم کا خطرہ کس قدر حقیقی ہے؟ کیا پشتونستان کی جدوجہد پاکستانی کی علاقائی سالمیت اور داخلی استحکام کے لئے واقعی ایک خطرہ ہے؟ نہیں بالکل نہیں، آج کل پشتون قوم پرستی نسبتاً کمزور ہے اور اس بات کے بہت کم شواہد موجود ہیں کہ اس علاقے میں یہ تحریک دوبارہ ایک قابل ذکر قوت کے طور پر ابھر سکتی ہے۔ اگرچہ پاکستان اور افغانستان میں رہنے والے پشتونوں کے درمیان قریبی تعلق برقرار ہے لیکن سرحد کے دونوں جانب ایک مشترکہ اور معنی خیز سیاسی جدوجہد کے امکانات بہت محدود ہیں۔

پاکستانی پشتون افغان حکومت کو غیر فعال، مفلوک الحال اور وسائل سے محروم حکومت سمجھتے ہیں جو اپنے شہریوں کو بنیادی سہولتیں فراہم نہیں کر سکتی۔ (۴۲) وہ نہیں چاہتے کہ افغان ریاست پشتون علاقے تک پھیل جائے۔ تمام پشتون علاقوں پر مشتمل ریاست کا تصور بھی ایک سراب ہی ہے۔ حتیٰ کہ اکثر قوم پرست بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ اس صورت میں کوئی قابل عمل

ریاست وجود میں نہیں آ سکتی۔ اس وقت صوبہ سرحد کا نوے فیصد بجٹ حکومت پاکستان فراہم کرتی ہے۔ مرکزی حکومت کی مدد کے بغیر صوبہ سرحد کی حکومت کام نہیں کر سکتی۔

قوم پرستی کے ماڈل:

اوپر بیان کردہ وجوہات کے سبب اس تحریک میں عدم استحکام پیدا کرنے والی سیاسی قوت بننے کے امکانات بہت کم ہیں۔ لیکن اس تحریک کے خاتمے کا امکان بھی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اس کا مستقبل کیا ہوگا؟

۱۔ پارٹی پالٹکس:

پہلی بات یہ ہے کہ پشتون قوم پرستی صوبہ سرحد کی کئی سیاسی جماعتوں کے لئے ایک بنیادی نظریے کے طور پر برقرار رہے گی۔ عوامی نیشنل پارٹی (ANP) نے قوم پرستی کی اس روایت کو اپنا رکھا ہے اور وہ اسے ۱۹۳۰ء میں غفار خان کی عدم تشدد کی بنیاد پر چلائی جانے والی تحریک سے منسلک سمجھتے ہیں۔ بلوچستان کی پختون خواہ ملی عوامی پارٹی نے اپنے صوبے میں تقریباً یہی نظریہ اختیار کر رکھا ہے۔

۲۔ بھارت اور کابل کی جانب جھکاؤ:

اس تحریک کے جاری رہنے کی دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ پشتونوں کے سیکولر حلقے اسے بھارت اور کابل کی جانب جھکاؤ کیلئے ایک سیاسی علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ (۴۳) اے این پی کے قوم پرست تاریخی طور پر بھارت کی کانگریس پارٹی سے قریبی تعلق رکھتے ہیں اور یہ تعلق آج بھی برقرار ہے۔ وہ کابل میں بھارت کی جانب جھکاؤ رکھنے والی حامد کرزئی حکومت کی بھی حمایت کرتے ہیں اور جب اس کی کابینہ میں شمالی اتحاد کے تاجکوں کی اکثریت ہوتی ہے تو وہ بھی اپنے خیالات تبدیل کر لیتے ہیں۔ اگرچہ قوم پرستوں کے یہ نظریات پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کیلئے پریشان کن ہیں لیکن کابل اور دلی کے ساتھ ان کا تعلق اتنا کمزور اور غیر موثر ہے کہ اس سے دفاعی معاملات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

۳۔ صوبائی خودمختاری:

پشتون قوم پرستی کا سب سے موثر اظہار صوبہ سرحد کے لئے زیادہ سے زیادہ صوبائی خود

مختاری کے مسلسل دعوے کی شکل میں سامنے آیا۔ اس میں مندرجہ ذیل مطالبات شامل ہیں۔

- ☆ سرکاری افسروں کی تعیناتی کی آزادی
- ☆ صوبے میں تعمیر ہونے والے پن بجلی کے منصوبوں سے حاصل ہونے والی آمدنی کا حصول
- ☆ اور سکولوں میں پشتو زبان کی تعلیم وغیرہ۔

پشتون قوم پرست طویل عرصے سے صوبائی خودمختاری کیلئے جدوجہد کرتے رہے ہیں، تاہم مرکزی حکومت نے تاریخی طور پر صوبائی معاملات کو اپنی کڑی نگرانی میں رکھا ہے۔ حتیٰ کہ اے این پی جیسی جماعتیں اگر مرکز میں کسی مخلوط حکومت میں بھی شامل ہو جائیں تو بھی انہیں بہت کم رعایتیں ملتی ہیں۔ اس لیے امکان ہے کہ پشتون جماعتوں کی طرف سے صوبائی خودمختاری کیلئے دباؤ تو برقرار رہے گا لیکن اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوگا۔ (۴۴)

حالیہ این ایف سی ایوارڈ (نیشنل فنانس کمشن ایوارڈ) کے لئے مذاکرات کے دوران مرکز نے صوبہ سرحد اور دیگر چھوٹے صوبوں کے لئے بعض رعایتیں دی ہیں۔ اس ایوارڈ کو دو طرح سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ ٹیکس سے حاصل آمدنی کو مرکز اور صوبوں میں کس طرح تقسیم کیا جائے گا اور دوسرے یہ کہ صوبوں کے درمیان وسائل کی تقسیم کس طرح ہوگی۔

نئے فارمولے کے تحت صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کو پنجاب کی نسبت زیادہ فائدہ پہنچے گا۔ (۴۵) جبکہ مرکز کی نسبت صوبوں کو کچھ زیادہ فائدہ حاصل ہوگا۔ صوبہ سرحد سے پن بجلی کے پراجیکٹس سے حاصل ہونے والی رائلٹی کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔ جبکہ اسے دہشت گردی اور انتہاپسندی سے نمٹنے کیلئے خصوصی امداد ملنے کا بھی امکان ہے۔ تاہم اگر یہ مذاکرات اور معاملہ صوبے کی مرضی ومنشاء کے مطابق بھی طے ہو جائے تو بھی صوبے اور مرکزی حکومت کے تعلق میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئے گی۔

بلوچ انتشار اور مہاجر، پشتون اور بلوچ آبادی کے درمیان اختلافات سے توجہ ہٹانے کا کردار:

کراچی میں رہنے والے مہاجروں اور پشتونوں کے درمیان بہت واضح اختلافات پائے

جاتے ہیں۔مہاجر بھارت سے ہجرت کر کے کراچی میں آباد ہوئے، جبکہ پشتون بھی ہجرت کر کے یہاں آئے۔اسی طرح بلوچستان میں بلوچ اور پشتون آبادی کے درمیان بھی نمایاں اختلافات ہیں۔مہاجروں نے متحدہ قومی موومنٹ کے نام سے اپنی سیاسی جماعت بنالی ہے جو ایک شہری مڈل کلاس جماعت ہے اور اس کے کراچی کی پشتون آبادی کے ساتھ اختلافات مسلسل منظر عام پر آتے رہتے ہیں۔

یہ کہنا درست ہوگا کہ فوج کی موجودگی کے بغیر کراچی کے ان نسلی و لسانی اعتبار سے مختلف گروہوں کے درمیان تشدد کی شرح کہیں زیادہ ہوتی۔اگرچہ فوج کی توجہ اور اثر و رسوخ کا مرکز پنجاب ہے جس کے باعث وہ ان مختلف گروہوں کو قومی تعمیر کے حوالے سے کسی نقطے پر اکٹھا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ (۴۶) لیکن فوج نے کراچی میں مہاجر، پشتون اور بلوچ اختلافات کا فائدہ اٹھا کر یہاں قیام امن کی ذمہ دار ایک لازمی قوت کی حیثیت ضرور اختیار کر لی ہے۔اس طرح مرکز ان مختلف الخیال گروہوں کو آنے سامنے آنے سے روکتا ہے۔

بلوچستان کی شورش:

بلوچستان میں ماضی میں ہونے والی بدامنی پر قابو پانے میں فوج کو ہمیشہ سے خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔چونکہ بلوچوں میں مرکزی حکومت کی حمایت بہت کم ہے اس لیے فوج کو اپنی مدد کیلئے صوبے کی پشتون آبادی کی مدد لینی پڑتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ پاکستانی فوج کو صوبے میں انتشار کے دوران کوئٹہ اور دیگر علاقوں میں امریکی ڈرون حملوں پر شدید تشویش ہے کیونکہ کوئٹہ میں افغان پشتون طالبان کے خلاف امریکی حملوں سے فوج کے لئے پشتون آبادی کی حمایت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔(۴۷)

طالبان بطور پشتون قوم پرست:

۲۰۰۵ء کے بعد سے صوبہ سرحد میں طالبانائزیشن کا سب سے پریشان کن پہلو یہ ہے کہ طالبان نے خود کو ایک تنظیم کی بجائے ایک تصور کی شکل میں پیش کیا ہے، جس نے پاک افغان سرحد کے دونوں جانب روایتی قوم پرست سیاست کی جگہ لے لی ہے۔اگرچہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ آئندہ برسوں میں غفار خان کی بائیں بازو کی قوم پرست سیاست کا احیاء دوبارہ ہوگا

لیکن اصل خدشہ یہ ہے کہ کہیں اس عرصے میں طالبان افغانستان کے فارسی بولنے والوں (۴۸) (شمالی اتحاد اور بھارت کے حامی حلقے) اور اسلام آباد کے پنجابی غلبے کے خلاف خود کو پشتون عوام کے اصل محافظ کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔اسی لئے نیٹو فوجیں افغانستان میں طالبان کی بڑھتی ہوئی طاقت کے بارے میں کافی فکرمند ہیں۔جبکہ پشتونوں اور پنجابی قوتوں کے دیرینہ تعلقات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پاکستانی فوج کے کئی حلقے افغان پشتون طالبان کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں کیونکہ وہ انہیں تاریخی طور پر بھارت کے خلاف سٹریٹیجک ڈیپتھ یا تزویراتی گہرائی (Strategic Depth) کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔تاہم ابھی تک پاکستانی طالبان کی جانب سے پشتون ازم کی جگہ لینے کیلئے کوئی خاص پیش رفت سامنے نہیں آئی، لیکن وہ پہلے ہی ایم ایم اے کی شکل میں پشتون شکایات کی علامت بن کر صوبے کا سیاسی منظرنامہ تبدیل کر چکے ہیں۔ مذہبی جماعتوں کے اتحاد ایم ایم اے (متحدہ مجلس عمل) نے ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۷ء کے دوران صوبہ سرحد پر حکمرانی کی اور اس دوران پشتون مسائل کو مذہبی رنگ دے کر خود کو یعنی مذہبی جماعتوں کو پشتون عوام کے حقوق کا نمائندہ بنا کر پیش کیا۔

۲۰۰۸ء کے انتخابات میں جب اے این پی نے ایم ایم اے کو شکست فاش دے دی تو اس کو پشتون قوم پرست تحریک کے احیاء کے طور پر دیکھا گیا۔لیکن حقیقت یہ تھی کہ طالبان کی جانب سے اسلامی شریعت کے نفاذ کا سلسلہ جاری رہا کیونکہ طالبان اے این پی کے خلاف تشدد کے ذریعے اسے زبردستی نافذ کرتے رہے۔اس طرح انہوں نے پشتون مسئلے کو مذہبی رنگ دے کر صوبائی خودمختاری کے مسئلے سے توجہ ہٹادی اور پشتون شناخت کی بحث کا رخ موڑنے میں کامیاب ہوگئے۔

چونکہ آئندہ برسوں میں طالبان خود کو بزور طاقت پشتون تحریک کے طور پر متعارف کرانے کی کوشش کریں گے جس پر پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی جانب سے ملے جلے ردعمل کا امکان ہے۔ایک جانب تو پاکستانی فوج کی اہم قوتیں افغان پشتون طالبان کی تحریک کو سٹریٹیجک اثاثے کی حیثیت دیتی ہیں جو افغانستان میں شمالی اتحاد کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال ہوسکتا ہے اور اس کے ذریعے کامل سے پشتون شکایات کا ازالہ کرایا جا سکتا ہے۔جبکہ دوسری جانب صوبہ سرحد میں طالبان کے زیر اثر علاقوں میں پشتون قوم پرست طالبان کی

تعداد میں اضافہ باعث تشویش ہے کیونکہ ان سے پاکستانی ریاست کے استحکام کو خطرہ اور علیحدگی پسندوں کی حوصلہ افزائی کا خدشہ ہے۔ دراصل طالبان پاکستان اور افغانستان میں پشتونوں کی سب سے مضبوط قوت کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، اور اب وہ بآسانی پشتون حقوق اور شناخت کے ایک ایسے محافظ کے طور پر سامنے آ سکتے ہیں جو کابل اور اسلام آباد دونوں کیلئے پریشان کن ثابت ہو سکتا ہے۔

قابل غور امور:

☆ افغانستان میں امریکہ کی کارروائیوں میں تیزی کے بعد پاک افغان سرحد کے دونوں جانب طالبان کی جانب سے پشتون شناخت کی اپیلوں میں اضافہ۔

☆ کیا القاعدہ اور مذہبی جماعتیں بھی طالبان کو بھی پشتونوں کے نمائندے کی حیثیت دیں گی۔

☆ کیا پاکستانی حکومت اور قوم پرست جماعتوں کے درمیان صوبائی خودمختاری، محاصل کی صوبے کو منتقلی اور صوبے کا نام تبدیل کر کے پختون خواہ رکھنے کے متعلق مذاکرات میں کوئی پیش رفت ہو سکے گی۔

☆ کراچی میں مہاجروں اور پشتونوں کے اختلاف میں اضافہ۔

☆ کوئٹہ میں افغان طالبان رہنماؤں پر مستقبل میں نیٹو حملوں کے اثرات اور پاکستانی فوج کی جانب سے بلوچستان پر کنٹرول کی صلاحیت۔

☆☆☆

باب 5

پاکستانی طالبان کا مستقبل

گذشتہ دو برس کے دوران پاکستانی طالبان کی قوت میں ڈرامائی تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ ۲۰۰۹ء کے موسم بہار میں انہوں نے وادیٔ سوات کا کنٹرول حاصل کر لیا اور علاقے سے حکومتی رٹ کا خاتمہ کر کے یہاں اپنا انتظام قائم کر لیا۔ کچھ عرصے بعد جب طالبان کے کچھ گروپ سوات سے ملحق ضلع بونیر (جو اسلام آباد سے صرف ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے) میں داخل ہو گئے تو کئی لوگوں کا خیال تھا کہ اب طالبان کی پیش قدمی جاری رہے گی اور وہ بڑے شہروں میں بھی داخل ہو جائیں گے۔

لیکن چند ماہ بعد ہی جب فوج نے سوات اور بونیر کے زیادہ تر علاقوں سے طالبان کو نکال باہر کیا اور امریکی ڈرون طیاروں کے حملوں میں بیت اللہ محسود سمیت کئی سینئر طالبان رہنما مارے گئے تو طالبان کی قوت کم ہوتی محسوس ہوئی۔ اس وقت پاکستان کی اندرونی سلامتی کے ذمہ دار حلقوں کے لئے طالبان کوئی حقیقی خطرہ نہیں رہے۔ جنوبی وزیرستان میں طالبان کے خلاف آپریشن بھی اس خطرے میں کمی کی واضح نشاندہی کرتا ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ کچھ عرصہ تک طالبان کی قوت میں اتار چڑھاؤ آتا رہے گا کیونکہ دونوں فریق ایک دوسرے کی طاقت کا امتحان لیتے رہیں گے، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ آئندہ برسوں میں طالبان تحریک کیا شکل اختیار کرے گی۔ اس رپورٹ میں طالبان کی جانب سے آئندہ اپنائے جانے والے متعدد ممکنہ لائحہ عمل اور اس کے جواب میں پاکستانی حکومت کے ردعمل کا جائزہ لیا گیا

ہے۔ اس وقت پاکستانی طالبان ایک اکائی کی شکل میں نہیں ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ یہ تحریک الگ الگ گروپوں اور ملتے جلتے مقاصد رکھنے والے کئی گروہوں کو ایک چھتری مہیا کرتی ہے۔ اس وقت پاکستانی طالبان اپنے مقاصد کے حصول کیلئے چھ مختلف پالیسیوں یا لائحہ عمل کے ذریعے کام کر رہے ہیں اور انہی سے مستقبل میں ان کی پیش رفت کا اندازہ لگایا جا سکے گا۔

ا۔ متعدد محاذوں پر لڑائی:

یہ بات واضح نہیں ہے کہ طالبان کی سرگرمیوں کو کس طرح ہم آہنگ کیا جاتا ہے لیکن ان میں ہم آہنگی بہرحال موجود ہے۔ طالبان کو اس بات کا احساس ہے کہ بیک وقت مختلف کارروائیوں اور کئی محاذوں پر لڑنے سے بہت فائدہ ہوتا ہے، کیونکہ صوبہ سرحد میں فوج ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ دو محاذوں پر لڑائی کر سکتی ہے۔ جنگی اہمیت کے ان مقامات تک رسائی کیلئے فوجی دستوں کو ایک دوسرے سے الگ ہونا پڑتا ہے اور علاقوں کے درمیان زیادہ فاصلے کے سبب طالبان فوج کو مسلسل معروف رکھ سکتے ہیں۔ وہ پہلے ہی صوبے کے کئی علاقوں میں خاصی مضبوط پوزیشن حاصل کر چکے ہیں اور انہوں نے خاصے موثر طریقے سے فوج کو آگے بڑھنے سے روکا ہے۔

طالبان نے جنوبی پنجاب کے تشدد پسند گروپوں کے ساتھ تعلقات کو استعمال کرتے ہوئے بھی اسی لائحہ عمل کو توسیع دی ہے۔ ان شدت پسندوں کا مقابلہ کرنے کیلئے فوجی دستوں کو پنجاب میں بھیجنے کے بارے میں فوج کا رویہ کافی محتاط ہے، کیونکہ فوج ان میں سے بعض گروپوں کو بھارت کے خلاف یا چند اور معاملات میں آج بھی مفید سمجھتی ہے۔ لیکن پنجابی گروپوں کے ساتھ طالبان کے روابط سے حکومت کو خاصی مشکلات کا سامنا ہے۔[۴۹] فوج کے لئے ایک اور اہم مسئلہ طالبان کی جانب سے کراچی جیسے بڑے شہر کو اپنے مقصد کیلئے استعمال کرنا ہے۔ وہ شہر کی کچی آبادیوں اور پشتون اکثریتی علاقوں کو اپنے مرکز کے طور پر استعمال کر کے حکومت کیلئے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔[۵۰] کراچی میں طالبان کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کا ایک ممکنہ نتیجہ ایم کیو ایم اور دیگر مہاجر حلقوں کے ساتھ ان کے جھگڑوں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

اس مسئلے کا سامنا کرنے کیلئے حکومت ابھی تک روایتی طریقوں پر عمل پیرا ہے۔ یعنی ایک وقت میں ایک یا دو محاذوں پر لڑائی کی جائے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ کسی صورت میں فوجی

اسٹیبلشمنٹ کے مفادات کو زد نہ پہنچے، نیز یہ کہ عالمی برادری کی تنقید سے بچتے ہوئے افغانستان میں اپنے سٹریٹیجک مفادات پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا جائے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ جب بیک وقت اتنے محاذوں پر مقابلہ ہو تو کیا حکومت کا یہ لائحہ عمل کامیاب ہو سکتا ہے۔ خصوصاً اس صورت میں جب فوج بھارتی خطرے کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی، جو اس کیلئے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

۲۔ مقامی مسائل سے فائدہ اٹھانا:

اب تک طالبان کا سب سے موثر لائحہ عمل یہ رہا ہے کہ عوامی شکایات کا ازالہ کر کے ان کی حمایت حاصل کی جائے۔ بعض علاقوں میں یہ مسائل انصاف کی عدم فراہمی کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ مثلاً جائیداد اور زمینوں کے جھگڑوں میں بر وقت انصاف نہ ملنا اور زمیندار کے خلاف عوامی جذبات وغیرہ۔ جبکہ بعض علاقوں میں طالبان نے مجرموں کے خلاف کارروائیاں کر کے عوامی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے بعض علاقوں میں کچھ مبہم مطالبات مثلاً اسلامی قوانین کا نفاذ، این جی اوز اور بعض غیر ملکی عناصر کی موجودگی کے خلاف مقامی لوگوں کی تشویش پر بھی کئی کارروائیاں کیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب وہ کسی علاقے کا کنٹرول حاصل کر لیتے ہیں تو پھر وہ وہاں جرائم کا اپنا نیٹ ورک قائم کر لیتے ہیں، اور اس کے ذریعے نفاذ شریعت جیسے اقدامات متعارف کراتے ہیں۔

عوامی مسائل اور پریشانیوں کے حل میں طالبان کی شرکت پر حکومت روایتی سست ردعمل ظاہر کرتی ہے۔ مثلاً وادی سوات میں عوام گذشتہ پندرہ سال سے نظام انصاف میں بہتری کا مطالبہ کر رہے تھے لیکن حکومت نے اس سلسلے میں کوئی خاص پیش رفت نہیں کی۔ تاوقتیکہ ۲۰۰۹ء کے اوائل میں یہاں طالبان نے قبضہ کر لیا۔ دیکھا جائے تو اس بات کا امکان اب بھی موجود ہے کہ طالبان یہ کوشش جاری رکھیں گے کہ عوامی مسائل کے حل کے بہانے لوگوں کی ہمدردی حاصل کی جائیں، لیکن اس سلسلے میں ایک مثبت بات یہ ہے کہ چونکہ سوات اور بونیر کے عوام طالبان کے بدترین تشدد کا سامنا کر چکے ہیں، اس لیے وہ دوبارہ ان کے نعروں اور وعدوں کے چکر میں نہیں آئیں گے۔ (۵۱)

۳۔ شہری علاقوں میں سوفٹ (Soft) کنٹرول کی پالیسی:

۲۰۰۹ء میں وادی سوات پر طالبان کے کنٹرول کے دوران بعض میڈیا رپورٹ میں پیش گوئی کی گئی تھی کہ اب وہ پورے صوبہ سرحد پر قبضہ کر لیں گے۔ اگرچہ یہ ایک حقیقی خطرہ تھا لیکن عام طور پر طالبان حکومت سے ٹکر لیے بغیر اپنا اثر و رسوخ بڑھاتے ہیں۔ یعنی وہ کوشش کرتے ہیں کہ علاقے میں بظاہر حکومت کی موجودگی برقرار رہے لیکن معاملات کو چلانے کا اصل اختیار ان کے پاس آجائے۔ اس مقصد کیلئے وہ سرکاری ملازمین کو ڈرا دھمکا کر پولیس، یونیورسٹیوں، ٹرانسپورٹ ایسوسی ایشن اور دیگر اداروں میں اپنے لوگوں کو داخل کر دیتے ہیں اور یوں وہ حکومت سے براہ راست ٹکر لیے بغیر اپنے مقاصد حاصل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

حکومت کیلئے طالبان کی اس سوفٹ کنٹرول کی پالیسی کا مقابلہ کرنا خاصا دشوار ہوتا ہے، کیونکہ اس صورت میں فوجی کارروائی کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ لیکن سوات میں طالبان نے اس پالیسی پر عمل نہیں کیا اور انہوں نے علاقے پر مکمل قبضہ کر لیا۔ جس سے انہیں سخت ردعمل اور فوجی کارروائی کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ فوج نے محسوس کیا کہ ان حالات میں نہ صرف ان کی کمیونیکیشن لائن خطرے میں پڑ گئی ہے بلکہ سوات کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہ تھا کہ ملک میں فوج کے بارے میں اس تاثر کی بھی نفی ہو جاتی کہ وہ ملک کی سلامتی اور استحکام کی ذمہ دار قوت ہے۔ سوات پر قبضے کی طالبان کو خاصی بڑی قیمت چکانی پڑی، اس لیے مستقبل میں ان کی جانب سے بالواسطہ یا سوفٹ کنٹرول کی پالیسی اپنائے جانے کا زیادہ امکان ہے۔

۴۔ فرقہ وارانہ اختلافات سے فائدہ اٹھانا:

دیگر تشدد پسند تنظیموں کی طرح طالبان بھی اپنے مقاصد کے حصول کیلئے ملتے جلتے ایجنڈے رکھنے والے انتہاپسند گروپوں کا تعاون حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ صوبہ سرحد میں متعدد بار انہوں نے ایسے فرقہ پرست گروہوں سے اتحاد کیا ہے جو سنی اکثریت اور شیعہ اقلیت کے درمیان اختلافات سے فائدہ اٹھانے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ وہ صوبے کے کئی ایسے علاقوں میں فرقہ وارانہ اختلافات میں ملوث رہے ہیں جہاں شیعہ آبادی کی اکثریت ہے۔ ان میں کرم ایجنسی، جنوبی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان اور پشاور کے بعض علاقے شامل ہیں۔ (۵۲) فرقہ وارانہ فساد کے زیادہ واقعات میں طالبان کے پنجابی اتحادی گروپ لشکر

جھنگوی اور جیش محمد ملوث تھے۔

فرقہ واریت کو ہوا دینے سے طالبان کو متعدد فوائد حاصل ہوئے۔ علاقے میں شیعہ فرقے کے خلاف شکایات کا فائدہ اٹھا کر وہ سنی اکثریت کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، انہوں نے شیعہ اداروں اور ان کی خصوصی تقریبات پر حملے کئے اور وہاں حفاظت پر مامور پولیس والوں کو بھی نشانہ بنایا۔ بعد میں ایسے واقعات کا الزام انہوں نے بیرونی ہاتھ اور فرقہ وار تنظیموں پر لگا دیا۔ لیکن اس مسئلے سے سب سے بڑا فائدہ انہیں یہ ہوا کہ اس کے ذریعے انہوں نے پنجاب کی مسلح فرقہ پرست تنظیموں سے اتحاد کیا، جہاں تاریخی طور پر فرقہ واریت کی ایک تاریخ موجود ہے۔ پنجاب کے شدت پسند گروپوں نے بھی صوبہ سرحد منتقلی اور وہاں طالبان کے ساتھ مل کر لڑنے میں خاصی دلچسپی کا اظہار کیا۔ جبکہ طالبان نے ان کے ساتھ مستقبل میں پنجاب، کشمیر اور دیگر علاقوں میں اسی نوعیت کی کارروائیوں میں جوابی تعاون کا دعویٰ کیا۔

مستقبل میں ان کے تعاون کی کم از کم صورت یہ ہوگی کہ صوبہ سرحد میں طالبان پنجابی فرقہ پرستوں کو اپنی قوت میں اضافے اور مشترکہ مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کرتے رہیں گے۔ جبکہ بدترین صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ان گروہوں کے ساتھ طالبان تبدریج ایک مستقل اور مضبوط اتحاد قائم کر لیں۔ اس سے خدشہ ہے کہ صوبہ سرحد کے جنوبی علاقوں، شمالی علاقہ جات کے شیعہ اکثریتی شہر گلگت اور پنجاب کے شیعہ آبادی والے شہروں میں شیعہ فرقے کی مخالفت اور ان کے خلاف تشدد طالبان کی پالیسی کا لازمی حصہ بن جائے۔ اس کے علاوہ ان کی جانب سے دیگر اقلیتوں مثلاً عیسائی اداروں (سکولوں، گرجا گھروں اور مشنری ہسپتالوں) کو پشتون معاشرے میں غیر ملکی اثر و نفوذ کا ذمہ دار قرار دے کر نشانہ بنانے کا خدشہ بھی موجود ہے۔

۵۔ متحد شکل میں سامنے آنا:

متعدد مواقع پر طالبان گروپ ایک متحدہ گروہ اور مشترکہ نام مثلاً اتحاد شوریٰ المجاہدین یا تحریک طالبان پاکستان کے نام سے سامنے آتے رہے ہیں۔ اگست ۲۰۰۹ء میں امریکی ڈرون حملے میں بیت اللہ محسود کی موت تک ان گروپوں کی سربراہی اس کے پاس تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا خود کو ایک متحد گروپ کی صورت میں پیش کرنا صرف ایک چالاکی تھی یا یہ لوگ واقعی ایک منظم اور متحد قوت ہیں؟ اور اپنی کارروائیوں کیلئے آپریشنل پلاننگ کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ ماہرین کا خیال

ہے کہ پاکستانی طالبان گروپ اپنے مخالف مارکسٹ/ سوشلسٹ گروپوں کی طرح ڈھیلے ڈھالے اتحاد کی شکل میں کام کرتے ہیں۔ ایک مشترکہ چھتری کے نیچے آ جانے سے طالبان گروپوں کو کئی فوائد حاصل ہو جاتے ہیں، اس سے ان کی قانونی پوزیشن بہتر ہو جاتی ہے، وہ زیادہ وسائل استعمال کر سکتے ہیں اور انہیں دیگر انتہا پسند گروپوں اور مقامی قبائلیوں سے بھی تحفظ مل جاتا ہے۔

آج کل پشتون قبائلی معاشرے میں پائے جانیوالے انتشار کے باعث ایسی تنظیمیں زیادہ عرصے تک کسی نظم و ضبط کے تحت کام نہیں کر سکتیں۔ اگر تحریک طالبان پاکستان بیت اللہ محسود جیسا کوئی دوسرا رہنما تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے جو اس کی طرح بکھرے ہوئے طالبان گروپوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئے اور تنظیم کو زیادہ منظم شکل دینے کے علاوہ ایک موثر جنگی حکمت عملی بھی تیار کر سکے تو اس سے پاکستانی حکومت کیلئے کئی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ طالبان کی مرکزی تنظیم ہونے کی صورت میں حکومت کیلئے اس سے مذاکرات کرنا آسان ہو جائے گا، لیکن ایسی صورت میں طالبان کی قوت میں بہت اضافہ ہو جائے گا اور وہ نہ صرف حکومت سے زیادہ رعایتیں لے سکیں گے بلکہ ان کیلئے پشتون عوام کو یہ یقین دلانا بھی آسان ہو جائے گا کہ وہی دراصل ان کے حقیقی نمائندے ہیں۔

۶۔ معاہدوں کے لئے دباؤ:

حکومت اور طالبان کے درمیان طویل عرصے سے امن معاہدے ہوتے رہے ہیں یہ معاہدے دونوں فریقوں کیلئے مفید ہوتے ہیں، حکومت ان معاہدوں کے ذریعے علیحدگی پسند کارروائیوں کے خلاف اور حکومتی عملداری کے احترام میں بہتری کی خواہش مند ہوتی ہے، کیونکہ ایسی کارروائیوں میں اضافے سے ملک کے دیگر حصوں میں بھی ایسی شورشیں جنم لے سکتی ہیں، جبکہ طالبان ان معاہدوں کے ذریعے اپنی حیثیت اور اثر و رسوخ کو زیادہ جائز و قانونی شکل دینے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے معاہدوں سے طالبان کے خلاف فوجی کارروائی بھی مشکل ہو جاتی ہے۔

تاریخی طور سے دیکھا جائے تو حکومت طالبان یا دیگر شدت پسند گروپوں کے ساتھ اس وقت معاہدہ کرتی ہے جب وہ نسبتاً کمزور پوزیشن میں ہو، کئی بار ایسے معاہدے صرف ریاست کی قانونی حیثیت کو بہتر بناتے ہیں لیکن اصل میں ان سے شدت پسندوں کو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے،

کیونکہ اس طرح وہ متعدد فوائد اور اثر و رسوخ حاصل کرنے کے علاوہ متعلقہ علاقے سے فوج کی واپسی جیسی شرائط بھی منوا لیتے ہیں۔ کئی بار ان معاہدوں کے نتیجے میں پاک افغان سرحد کے دونوں جانب شدت پسند کارروائیوں میں کمی آجاتی ہے اور بظاہر دونوں فریقوں کو فائدہ پہنچتا ہے تاہم اس سے معاملے کے بیرونی کھلاڑیوں یعنی امریکہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

اس وقت پاکستانی عوام اور پالیسی ساز دونوں کی رائے طالبان کے ساتھ معاہدوں کے حق میں نہیں ہے، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ حکومت معاہدوں کے باب کو مکمل بند نہیں کرے گی۔ ۲۰۰۹ء کے آخر میں جنوبی وزیرستان میں ہونے والے فوجی آپریشن کے باوجود حکومت فاٹا میں طالبان کے ساتھ بات چیت جاری رکھنا چاہتی ہے، کیونکہ اس علاقے میں فوجی کارروائی زیادہ قابل عمل حل نہیں ہے۔

قابل غور امور:

☆ کیا حکومت فاٹا اور دیگر علاقوں میں طالبان کے ساتھ امن معاہدوں کا سلسلہ جاری رکھے گی؟

☆ کیا حکومت طالبان کی نفاذ شریعت کی اپیلوں کا تدارک کرنے کی کوشش کرے گی؟ (۵۴)

☆ کیا شدت پسند پنجابی گروپ اور شیعہ مخالف تنظیمیں مکمل طور پر طالبان میں ضم ہو جائیں گی، یا محض ایک ڈھیلا ڈھالا اتحاد برقرار رہے گا؟ بالفاظ دیگر اس وقت ان گروپوں کے باہمی تعلقات میں اضافہ ہو رہا ہے یا یہ محض پنجابی گروپوں کی جانب سے افغانستان کی لڑائی میں حصہ لینے کی خواہش کا اظہار ہے؟ لیکن لگتا یہی ہے کہ ان کا آپسی تعاون محض وقتی فائدے کے حصول کیلئے ہے۔

☆ کیا سوات اور جنوبی وزیرستان سے فوج واپس جانے کے بعد وہاں طالبان واپس آجائیں گے؟

☆ کیا خودکش دھماکوں کی شکل میں ملک بھر میں لڑی جانے والی لڑائی سے طالبان پاکستانی عوام اور فوج کا مورال ختم کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے؟ پشاور جیسے شہروں میں کتنے خودکش دھماکوں کے بعد ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا جائے گا؟ اور کیا نوجوان افسر اور جوان فاٹا جیسے دشوار گذار علاقے میں طالبان کے خلاف جنگ جاری رکھنے کے خواہش مند ہیں؟

پاکستانی طالبان کا مستقبل:

گذشتہ سال کے واقعات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اگر فوج چاہے تو وہ بزور طاقت

طالبان کو آگے بڑھنے سے روک سکتی ہے۔ سوات اور فاٹا آپریشن میں بہت زیادہ جانی نقصان کے باوجود فوج کو کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن فوج اب بھی دشوار گذار علاقوں میں آپریشن کی بجائے انتہا پسندوں سے وسط اور طویل مدتی معاہدوں کی خواہش مند ہے۔ اس سلسلے میں جنوبی وزیرستان کا آپریشن ایک ٹیسٹ کیس ہے۔ اس بات کا امکان موجود ہے کہ کچھ عرصے بعد فوج یہ فیصلہ کرے کہ وہ فاٹا میں لڑائی کی بجائے وہاں معاہدوں کے ذریعے مختلف قبیلوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے بھی اپنا مقصد حاصل کر سکتی ہے۔ اگرچہ اس سے امریکی مقاصد پورے نہیں ہوں گے، لیکن اس طریقے سے فوج اپنے جانی نقصان اور ان علاقوں سے بے گھر افراد کی تعداد میں کمی کر سکتی ہے۔

آئندہ ایک سے تین برس کے دوران طالبان کی فتوحات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکے گا کہ وہ اوپر درج ان چھ پالیسیوں پر کس قدر عمل درآمد کر سکیں گے؟ اگرچہ وہ ان تمام طریقوں پر عمل نہیں کر سکیں گے لیکن دیکھا جائے تو انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اگر وہ دو یا تین طریقوں پر بھی عمل کر پائے تو ریاست کیلئے بڑی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ طالبان کی پیش رفت کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ ریاست انہیں آگے بڑھنے کی کس قدر اجازت دیتی ہے۔ طالبان جانتے ہیں کہ وہ چند اہم پابندیوں کا خیال رکھیں تو ان کیلئے مختلف علاقوں پر کنٹرول، وسائل تک رسائی، اسلامائزیشن، لوگوں کی بھرتی اور مقامی آبادی کو مغربی طاقتوں کے خلاف متحرک کرنا ممکن ہے۔

وہ اہم پابندیاں (ریڈ (Red) لائنز) یہ ہیں۔

☆ علیحدگی پسند قومی لسانی تحریک کا قیام

☆ سرکاری کنٹرول والے علاقوں میں حکومتی رٹ کے خاتمے کی شرمندگی

☆ صوبہ سرحد میں انتہا پسندوں کی موجودگی کے باعث افغانستان میں پاکستانی مقاصد کے حصول میں مشکلات۔

جب تک طالبان ان بنیادی رکاوٹوں کو عبور نہیں کریں گے تو ان کے اور حکومت کے درمیان معاہدوں کے وسیع امکانات موجود ہیں۔ اس سے نہ صرف فاٹا میں ان کی مستقل موجودگی کو قبول کر لیا جائے گا بلکہ وہ مزید پیش قدمی بھی کر سکیں گے۔

☆☆☆

باب 6

پاک بھارت تعلقات

پاک بھارت تعلقات کی طویل تاریخ کا جائزہ لینے کی اس رپورٹ میں گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اس باب میں تاریخی تناظر کے حوالے سے امن عمل اور پاک بھارت اختلافات کو دوستانہ تعلق میں بدلنے کے امکانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۱۔تعلقات کا تاریخی پس منظر:

پاکستان کی شناخت مذہب اور بھارت سے مختلف ہونے سے تعبیر کی جاتی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں بھارت کی تقسیم کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آیا اور ایک الگ ملک کا درجہ حاصل کیا۔ (۵۴) آغاز ہی سے دونوں ملکوں کے تعلقات، اختلافات اور شکوک وشبہات سے بھر پور تھے۔ تقسیم کے نتیجے میں دونوں جانب سے آبادی کی بڑی تعداد ہجرت کر کے دوسرے ملک میں گئی، اس موقع پر بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ خونی فسادات بھی ہوئے۔ لیکن دونوں ملکوں کے تعلقات کو مسئلہ کشمیر کو بیان کیے بغیر اچھی طرح سمجھا نہیں سکتا۔

پاکستان نے بھارت کے ساتھ ۱۹۴۷ء، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں تین جنگیں لڑیں اور شکست کھائی۔ پہلی دو جنگیں مسئلہ کشمیر پر لڑی گئیں، جبکہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے نتیجے میں پاکستان کا مشرقی حصہ اس سے الگ ہو کر ایک الگ ملک بنگلہ دیش بن گیا۔ چونکہ بھارت کا وسیع رقبہ اسے سٹریٹیجک ڈیپتھ (Strategic depth) فراہم کرتا ہے لیکن پاکستان کے بڑے شہر لاہور اور کراچی

بھارتی جنگی حملے کی زد میں ہیں۔ بھارت کے مقابلے میں کمزوری کا یہ احساس اس وقت کئی گنا بڑھ جاتا ہے جب معاشی میدان میں بھی بھارت کی کامیابیاں کئی گناہ زیادہ نظر آتی ہیں۔ بھارتی فوج پاکستانی فوج سے تین گنا بڑی ہے جبکہ اس کی فضائیہ پانچ گنا اور نیوی کی قوت پاکستان سے چھ گنا زیادہ ہے، اگر چہ محض سائز سے کسی جنگ کے نتیجے کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، اور ایٹمی قوت بننے کے بعد پاکستان کے اعتماد میں بھی بہت اضافہ ہوا لیکن بھارت کی جانب اس کے شکوک و شبہات میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بھارتی حملے کی صورت میں پاکستانی سرحدوں کے اندر مطلوبہ تحفظ (Depth) میسر نہیں ہے اس لیے پاکستانی فوج ایک طویل عرصے سے اپنے پچھواڑے میں دفاعی پالیسی ''ڈیفنس ان ڈیپتھ'' (Defence in Depth) پر عمل پیرا ہے۔ پاکستان کیلئے اس سٹریٹیجک ڈیپتھ کا مطلب یہ ہے کہ بھارتی حملے کی صورت میں پاکستانی فوج افغانستان کو پسپائی اور دوبارہ تیاری کیلئے استعمال کر سکے۔ (۵۵) کسی حد تک اس وجہ سے بھی پاکستان کی خواہش ہے کہ افغانستان میں ایک پشتون اکثریتی حکومت قائم ہو، اور اسی لیے وہ افغانستان میں ایک ایسی حکومت کی سخت مخالفت کرتا ہے جو بھارت کی جانب جھکاؤ رکھتی ہو۔ (۵۶) اس وقت افغانستان میں بھارتی اثر ورسوخ کے بارے میں پاکستان میں کئی کہانیاں مشہور ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ افغانستان میں بھارتی قونصل خانوں کی تعداد سولہ سے اکیس تک ہے۔ (درحقیقت ان کی تعداد چار ہے اور عملہ بھی زیادہ نہیں ہے)

۲۔جامع مذاکرات:

۱۹۹۹ء میں کشمیر میں کارگل کے مقام پر پاکستانی فوج کے اس وقت کے سربراہ جنرل مشرف کی قیادت میں پاکستانی فوج کے ناکام حملے اور ۲۰۰۱ء کے آخر میں کشمیری اور بھارتی پارلیمنٹ پر پاکستانی انتہاپسندوں کے حملوں کے بعد بھارت نے اپنی فوج پاکستانی سرحد پر اکٹھی کر دی، جس سے ایٹمی ہتھیار رکھنے والی دونوں ریاستوں کے درمیان ایک بحران کی سی صورت پیدا ہو گئی۔

لیکن عالمی برادری کی کوششوں سے صورتحال میں بہتری آئی اور جنگ روک دی گئی۔ اس کے بعد ۹/۱۱ کے حملوں کے بعد امریکی دباؤ کے تحت پاکستان نے دہشت گرد گروپوں کے خلاف

کارروائی کی، جس سے پاکستان و بھارت کے درمیان ۲۰۰۴ء میں جامع مذاکرات کا آغاز ہوا۔ مذاکرات کے نتیجے میں کچھ عملی اقدامات بھی ہوئے جن کے تحت دونوں ملکوں کے درمیان تجارت اور سرحد پار تعلقات میں بہتری پیدا ہوئی۔ اس کے علاوہ کچھ علاقائی تنازعات کے حل کیلئے ایک فریم ورک بھی طے کیا گیا۔(۵۷)

۳۔مشرف حکومت کے خاتمے سے ممبئی حملوں تک امن عمل کی صورتحال:

۲۰۰۷ء میں بعض حلقوں کا کہنا تھا کہ پاکستان اور بھارت بیک چینل ڈپلومیسی کے ذریعے مسئلہ کشمیر کے حل کے قریب پہنچ گئے ہیں۔(۵۸) دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی میں کمی اور امن مذاکرات کا یہ عمل جنرل مشرف کی زیر نگرانی ہوا جو کارگل کے واقعہ کے ذمہ دار تھے۔

لیکن دونوں ملکوں نے اپنے عوام کو کشمیر پالیسی میں آنے والی تبدیلیوں کیلئے ذہنی طور پر تیار نہیں کیا اور اس تمام تر مثبت پیش رفت اور بہتر تعلقات کے پس منظر میں ایک دوسرے کے خلاف مخالفانہ جذبات اور غیر لچکدار رویے بدستور موجود رہے۔ پاکستان کشمیر کو ایک نامکمل حل تصور کرتا تھا جسے اختلافات کے خاتمے کے لئے استعمال کیا جا رہا تھا، وہ مسلسل اس مسئلے کے حل کیلئے عالمی برادری کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جبکہ بھارت اس مسئلے کو جوں کا توں برقرار رکھنا چاہتا تھا اور اس کے حل کیلئے کسی تیسرے فریق کو شامل کرنے کی ہر تجویز کو بری طرح مسترد کر دیتا ہے۔(۵۹) اس معاملے میں بھارت کا موقف یہ ہے کہ سرحدیں تبدیل نہیں ہو سکتیں مگر انہیں غیر اہم یا غیر متعلق کیا جا سکتا ہے، جبکہ کشمیر کا مستقبل دونوں ملکوں کے درمیان سرحد پار تعلقات میں اضافے سے طے کیا جانا چاہیے، جو وقت کے ساتھ ساتھ تجارتی معاہدوں اور کسٹم و معاشی یونین میں ڈھل جائے۔(۶۰) پاکستان اس موقف کو ضد، ہٹ دھرمی اور بے حسی پر مبنی سمجھتا ہے جس سے اسے بھارتی بالادستی کے خطرے کا اندیشہ ہے۔

۴۔ممبئی حملوں کے اثرات:

دونوں ملکوں کے درمیان جامع مذاکرات سے ہونے والی پیش رفت کو ۲۶ نومبر ۲۰۰۸ء کو ممبئی حملوں کے باعث شدید نقصان پہنچا۔ یہ دہشت گرد حملے یقینی طور پر لشکر طیبہ سے

تعلق رکھنے والے دہشت گردوں نے کئے تھے۔ اگرچہ بھارت میں عمومی اور ممبئی میں خصوصی طور پر دہشت گردی کی کارروائی کوئی نئی بات نہیں تھی، لیکن ان حملوں کو بھارتی سیاسی حلقوں نے گذشتہ واقعات کے مقابلے میں مختلف زاویے سے دیکھا۔ کیونکہ ان حملوں کے نتیجے میں پہلی بار بھارت کی باشعور، سیاسی اور متوازن مڈل کلاس متاثر ہوئی تھی جو ایسے واقعات برداشت کرنے پر تیار نہیں تھی۔

تاہم بھارت کے کسی سنجیدہ سیاستدان کو اس بات پر یقین نہیں تھا کہ پاکستانی حکومت ان حملوں سے آگاہ تھی یا اس نے ان کی منظوری دی تھی۔ مغربی انٹیلی جنس حلقوں کے مطابق بھارت اور امریکہ کے خفیہ ادارے ان حملوں کی کچھ تفصیلات سے آگاہ تھے، انہیں کسی حد تک حملوں کے وقت اور نشانہ بننے والوں کا علم تھا، لیکن وہ حملوں کے طریقے کار اور دیگر اہم تفصیلات سے لاعلم تھے، مگر پاکستانی آئی ایس آئی کے لشکر طیبہ سے روابط اور اثر و رسوخ کے باعث کوئی اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ آئی ایس آئی میں کوئی بھی ان حملوں کے بارے میں نہیں جانتا تھا، جن کی تیاری پر کئی ماہ صرف ہوئے ہوں گے۔ بھارت کو اس معاملے پر شدید طیش تھا کہ آئی ایس آئی نے لشکر طیبہ جیسی تنظیموں کی پرورش کر کے ایک ایسا بھوت پال لیا ہے جو اب اس کے اپنے کنٹرول میں بھی نہیں رہا۔ ممبئی حملوں میں ایک یہودی مرکز کو بھی نشانہ بنایا گیا جس سے ان حملوں کے ذریعے مغرب کو نشانہ بنانے کے خطرناک پہلو کی نشاندہی ہوئی اور اس سے یہ تاثر ملا کہ لشکر طیبہ اپنے کشمیری ایجنڈے سے آگے بڑھ کر عالمی جہادی تحریک کا حصہ بن گئی ہے۔ یہ حملہ خاص طور پر خلیجی ممالک میں اس کو فنڈ دینے والوں کو متاثر کرنے کیلئے تھا۔

۵۔امن عمل جاری رکھنے کا بھارتی فیصلہ:

۲۰۰۹ء میں بھارت کے انتخابات میں معتدل مزاج من موہن سنگھ دوبارہ منتخب ہو گئے۔ ممبئی حملوں کے باوجود ان کی حکومت نے دونوں ملکوں کے درمیان امن عمل اور زرداری حکومت کے ساتھ مصالحانہ رویہ برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا، تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان تاریخی تلخی کو بہتر تعلقات میں تبدیل کیا جا سکے۔ لیکن بھارت نے مذاکرات میں کشمیر کے مسئلے پر اپنا سخت موقف برقرار رکھا۔ تاہم جولائی ۲۰۰۹ء کو مصر میں شرم الشیخ کے مقام پر پاک بھارت وزرائے اعظم کی

ملاقات میں بھارتی وزیراعظم نے پاکستان کے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کو یقین دلایا کہ وہ بلوچستان کے انتشار میں بھارتی مداخلت کے الزامات کا جائزہ لیں گے۔لیکن صورتحال اب بھی تناؤ کا شکار ہے کیونکہ بھارتی پریس اور مقتدر سیاسی حلقوں نے شرم الشیخ میں اپنی حکومت کی جانب سے بہت زیادہ مفاہمت کے مظاہرے کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔خدشہ ہے کہ ممبئی طرز کے ایک اور حملے سے جامع مذاکرات کا عمل بالکل ختم ہو جائے گا اور بھارت کا ردعمل بہت شدید ہوگا۔

۶۔پاکستان کے بارے میں نئی بھارتی سوچ:

بھارت میں یہ سوچ تیزی سے پروان چڑھ رہی ہے کہ پاکستان کو کمزور کرنا بھارت کے مفاد میں نہیں ہے[۶۱] اور ایک کمزور پاکستان بھارت کے ایک عالمی طاقت بننے کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گا۔اگر پاکستان انتشار کا شکار رہتا ہے اور اسلام آباد کا کنٹرول کراچی اور صوبہ پنجاب سے متصل علاقوں پر ختم ہو جاتا ہے تو خدشہ ہے کہ ان علاقوں سے مہاجرین پاک بھارت سرحد عبور کر کے شمالی بھارت میں داخل ہو جائیں گے۔بھارت کے ان علاقوں میں پہلے ہی بہت زیادہ آبادی اور نکسل بغاوتوں کا خدشہ ہے۔اس کے علاوہ ایک غیر مستحکم پاکستان کی وجہ سے ممبئی حملوں کی طرح کے مزید حملے ہو سکتے ہیں اور ان حالات میں افغانستان میں استحکام لانا بھی بہت دشوار ہو جائے گا۔جبکہ آئی ایس آئی کو بھارت کے شمال مشرقی حصے میں قوم پرست اور سکھوں کی تحریکوں کو ابھارنے سے روکنا بھی مشکل ہو جائے گا۔پاکستان کے ساتھ خراب تعلقات کے باعث بھارت سرحد پار گیس کی فراہمی کے منصوبوں آئی پی آئی (IPI) اور ٹی اے پی آئی (TAPI) میں شریک نہیں ہو سکے گا،اور دوطرفہ تجارت کے مواقع سے بھی محروم ہو جائے گا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ پاکستان میں عدم استحکام اسے بھارت کے پرانے حریف چین کے مزید قریب لے جائے گا،چین پہلے ہی بلوچستان میں گوادر بندرگاہ کی تعمیر کے ذریعے بحیرہ ہند تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔

تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے؟ ایک مستحکم ہمسائے کے حصول کیلئے بھارت کو دونوں ملکوں کے درمیان اختلافات میں کمی اور بہتر تعلقات کیلئے کیا کرنا ہوگا؟ تجارت میں رعایت سے آغاز کیا جا سکتا ہے۔بھارتی معیشت بہت مضبوط ہے اور وہ تباہ حال پاکستانی معیشت کو بہتر بنانے میں مدد

دے سکتا ہے۔بھارت دونوں ملکوں کے درمیان ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد کم کرنے کیلئے علاقائی سطح پر بات چیت تجویز کر سکتا ہے۔اس کے علاوہ دونوں ملک اپنی خفیہ ایجنسیوں کے بارے میں پائے جانے والے شکوک وشبہات،پانی کے مسائل اور کشمیر کے بارے میں بات چیت کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔

۷۔آئی ایس آئی بمقابلہ را(ریسرچ اینڈ انالائسنز ونگ):

پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات کی خرابی کی ایک اہم وجہ دونوں ملکوں کی خفیہ ایجنسیوں کے درمیان کئی عشروں سے جاری خفیہ جنگ ہے۔یہ جنگ ایک دوسرے کے مخالفین کو استعمال کر کے لڑی جاتی ہے۔[۶۲] چونکہ بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' سول حکومت کے کنٹرول میں ہے اس لیے بھارت کیلئے آسان ہے کہ وہ تعلقات کی خرابی اور مقابلہ بازی کے اس طریقہ کار کو ختم کرنے میں پہل کرے،پاکستان کی آئی ایس آئی کو ابھی تک سویلین کنٹرول میں نہیں لایا جا سکا۔[۶۳] شاید کسی اور چیز سے دونوں ملکوں کے تعلقات کو بہتر بنانے میں اتنی مدد نہیں مل سکتی جتنی ان کی خفیہ ایجنسیوں کے طریقہ کار میں تبدیلی سے مل سکتی ہے۔[۶۴]

۸۔کشمیر اور پانی:

پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کی ایک بڑی وجہ پانی کا مسئلہ ہے۔دونوں ملکوں کے درمیان پانی کی تقسیم ''انڈس واٹر ٹریٹی'' معاہدے کے تحت ہوتی ہے۔جو ابھی تک خاصا کارگر ثابت ہوا ہے،لیکن اب شمالی بھارت میں پانی کی فراہمی کے ذخائر ہمالیہ کے گلیشیر بڑی تیزی سے پگھل رہے ہیں اور بھارت کو اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کیلئے پانی کی ضروریات پوری کرنا دشوار ہو رہا ہے۔دوسری جانب پاکستانی حکومت نے تسلیم کیا ہے کہ ملک پانی کی شدید کمی کے خطرے سے دوچار ہے اور پانی کی موجودہ فراہمی میں کمی سے ملک پر بے حد مضر اثرات مرتب ہوں گے بلکہ اس کی سلامتی تک خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

اس وقت مسئلہ کشمیر کے حل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اب یہ مسئلہ مکمل طور پر ایک فریق کے فائدے اور دوسرے کے نقصان میں بدل چکا ہے۔لیکن اگر کشمیر کو پانی اور ماحولیات کے حوالے سے کسی وسیع تر علاقائی بات چیت میں شامل کیا جائے تو اس کے محل وقوع

کے باعث یہ پاکستان، بھارت، چین، نیپال اور بنگلہ دیش کے درمیان کئی مسائل کے حل کا کردار ادا کرسکتا ہے۔(۶۵)

۹۔افغانستان میں بھارتی کردار، مستقل اختلافی مسئلہ:

ممکن ہے کہ پاکستان افغانستان کے معاملات میں بھارتی شرکت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہو مگر ایسی کشیدگی میں کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ بھارت کی جانب سے افغانستان کو امداد کی فراہمی پر پاکستان کے شکوک اس کی فوج کی جانب سے افغانستان کو اپنے مقاصد (سٹریٹیجک ڈیپتھ) کیلئے استعمال کرنے کی خواہش کے پیش نظر ہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ پاکستان کے ساتھ کشیدگی میں کمی سے بھارت کو افغانستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ سیاسی، معاشی اور سیکورٹی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ اوباما انتظامیہ کا یہ خیال بھی بھارت کے لئے اہم ہے کہ موجودہ جنگ میں افغانستان کی بجائے پاکستان کی اہمیت زیادہ ہے۔ اگر بھارت پاکستان کو افغانستان میں اپنے مقاصد کے بارے میں یقین دہانی کرا دیتا ہے تو اس سے افغانستان کے استحکام کیلئے امریکہ اور پاکستان کی پالیسیوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ یعنی جب تک پاکستان افغانستان کے استحکام کو بھارت افغان اتحاد کے ساتھ جڑا ہوا محسوس کرے گا، اس وقت تک وہ ایک مستحکم افغانستان کی مخالفت کرتا رہے گا۔

۱۰۔مستقبل پر نظر:

جب تک دونوں ملکوں کے تعلقات میں موجودہ پیچیدگی اور مشکلات کو درست طور پر سمجھا نہیں جاتا، اس وقت تک گذشتہ بحرانوں میں خفیہ ایجنسیوں کے کردار اور ناکامیوں اور پاکستان کے عدم استحکام جیسی باتیں بے فائدہ ثابت ہوں گی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ خطے کے دیگر ممالک باہمی اختلافات کے باوجود معاشی تعلقات قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ بھارت اور چین روایتی طور پر ایک دوسرے کے حریف رہے ہیں لیکن دونوں اپنے تعلقات کو بہتر بنا رہے ہیں۔ چین اور تائیوان بھی اپنے شدید ترین اختلافات پر قابو پا کر عوامی، معاشی اور تجارتی تعلقات کو بہتر بنا رہے ہیں۔

تجارتی لحاظ سے دیکھا جائے تو پاکستان اور بھارت کے درمیان بہتر تعلقات سے بھارت کو توانائی کی کمی پر قابو پانے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ کیونکہ افغانستان، ایران اور وسطی ایشیاء سے پاکستان کے راستے گیس پائپ لائن کی فراہمی سے بھارت کو گیس کے علاوہ اپنی درآمدات میں اضافے کا موقع بھی مل سکتا ہے۔ بھارت سے بہتر اقتصادی تعلقات پاکستان کیلئے کئی گنا زیادہ فائدہ مند ہیں۔ بھارت کیلئے پاکستان سے اچھے تعلقات اس لئے بھی لازم ہیں کہ یہ اس کے عالمی طاقت بننے کیلئے ضروری ہیں۔ بھارت سے کشیدگی میں حقیقی کمی سے پاکستان اپنے دفاعی اخراجات کو کم کر کے تعلیم وصحت کے شعبوں پر زیادہ خرچ کر سکتا ہے، ان شعبوں میں وسائل کی کمی پاکستان کیلئے ایک جدید ریاست بننے کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہیں۔(۶۶)

اس معاملے کا ایک اہم پہلو جس پر اس سے قبل توجہ نہیں تھی، یہ ہے کہ اس وقت تمام عالمی طاقتوں میں اس بات پر اتفاق پایا جاتا ہے کہ پاکستان کا ٹوٹنا یا ختم ہو جانا بہت خطرناک ثابت ہو گا۔ یہ خطرہ موجود ہے اور اس پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ عالمی برادری پاکستان کو صرف دہشت گردی کے حوالے سے ہی مسئلہ نہیں سمجھتی بلکہ اس وقت امریکہ، نیٹو، چین، جاپان، یورپ اور خلیجی ممالک پاکستان کی سلامتی پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ اس توجہ کو بھارت میں پیدا ہونے والی نئی سوچ سے مزید تقویت مل سکتی ہے کہ اسے اپنے ہمسائے سے سیاسی ونفسیاتی تعلقات بہتر بنانے چاہئیں۔ اس وقت پاکستان کی مدد کیلئے بھارت کو امریکہ یا دیگر ملکوں کی طرف دیکھنے کی بجائے خود آگے آنا ہو گا۔ پاکستان میں رائے عامہ کے ایک حالیہ سروے کے مطابق پاکستانی عوام اب بھارت کے مقابلے میں کہیں زیادہ امریکہ کی مخالفت کرتے ہیں۔(۶۷) یوں پاکستان کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے میں امریکہ کی مدد حاصل کرنا شاید بھارت کیلئے مفید ثابت نہ ہو۔ وزیر اعظم من موہن سنگھ اس مسئلے کو سمجھتے ہیں لیکن ابھی وہ پاکستان کے ساتھ ایک موثر امن معاہدہ کرنے کیلئے کانگریسی قیادت کا اتفاق رائے حاصل نہیں کر پائے۔

امریکہ اور برطانیہ میں پاکستان کی سابق سفیر ملیحہ لودھی کا کہنا ہے کہ پاکستان کی نوجوان نسل بھارت کو اتنا بڑا خطرہ نہیں سمجھتی، جتنا بھارت سے جنگ لڑنے والے پاکستانی فوجی سمجھتے

ہیں۔جبکہ کیری شفیلڈ کے مطابق بھارتی فوج کا خوف واضح اور ۱۹۷۱ء کی جنگ کے زخم ابھی تازہ ہیں، زیادہ تر پاکستانی بھارتی حملے کی بجائے اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ بھارت بطور ایک بڑی ریاست چھوٹی ہمسایہ ریاستوں سے کیسا سلوک کرتا ہے۔ گفتگو کیری شفیلڈ نومبر ۲۰۰۹ء، ملیحہ لودھی مارچ ۲۰۰۹ء سٹیفن ٹینکل کا خیال ہے کہ اگرچہ عوام میں امریکہ کی مخالفت بھارت سے زیادہ پائی جاتی ہے مگر فوج اب بھی بھارت کو زیادہ ناپسند کرتی ہے۔یعنی فوج کی سطح پہ امریکہ دونوں ملکوں کے درمیان مصالحانہ کردار ادا کرسکتا ہے۔

قابل غور امور:

☆ اگر بھارت میں ممبئی طرز کا ایک اور حملہ ہوگیا تو اس صورت میں اس کیلئے نومبر ۲۰۰۸ء جیسے طرز عمل کا مظاہرہ کرنا ممکن نہ ہوگا۔دونوں حملوں میں یہ فرق ہوسکتا ہے کہ ایک حملہ بھارتی پارلیمنٹ اور سیاسی قیادت سمیت ملک کی سیاسی بنیادوں پر کیا جائے گا۔

☆ کیا امریکہ نے افغانستان میں بھارت کی موجودگی کے بارے میں پاکستانی تشویش میں کمی کیلئے کوئی کوشش کی ہے؟

☆☆☆

باب 7

پاک چین تعلقات

دنیا کا کوئی اور ملک پاکستان کی خارجہ پالیسی اور سلامتی کے حوالے سے چین جتنی اہمیت نہیں رکھتا۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں چین کو امریکہ کا حلیف ہونے کے سبب پاکستان کے بارے میں شکوک وشبہات تھے۔ لیکن جب چین اور بھارت کے تعلقات خراب ہونے لگے اور نوبت ۱۹۶۲ء کی جنگ تک پہنچ گئی تو چین اور پاکستان کے تعلقات میں گرم جوشی پیدا ہو گئی۔ دونوں ملکوں نے جلد ہی اپنے سرحدی تنازعات طے کر لیے اور چین نے پاکستان کے ساتھ ایک سٹریٹیجک تعلق کا آغاز کر دیا۔ اس تعلق میں چین اور بھارت کے درمیان پاکستان ایک رکاوٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔ پاکستان کو چین کی شکل میں ایک قابل اعتماد حلیف، معاشی مددگار، سرمایہ کار اور فوجی امداد کی سہولت مل گئی۔ دونوں ملکوں کے تعلقات کے بارے میں پاکستان کے ایک سفارتکار اور سکالر کا کہنا ہے کہ پاک چین تعلقات بھارت کیلئے ایک رکاوٹ، جبکہ پاکستان کیلئے چین کی حیثیت بھارت سے تحفظ فراہم کرنے والے ایک طاقتور رضاتی جیسی ہے۔ (۶۸) یہ صورتحال پاک امریکہ تعلقات سے بالکل مختلف ہے جو مختلف وقفوں میں قائم ہوتے رہے اور دیگر معاملات کے ساتھ بری طرح مشروط رہے۔ جبکہ چین کے ساتھ پاکستان کی دوستی مستقل، یقینی اور ماضی قریب تک بالکل غیر مشروط رہی ہے۔ پاکستان کے سیاسی تجزیہ نگاروں کے مطابق دونوں ملکوں کی دوستی ہر اچھے اور برے وقت کی دوستی ہے۔ جس کے مقابلے میں امریکہ اور پاکستان کا تعلق محض اچھے وقت کے دوستوں کی مانند ہے۔

طویل دوستانہ تعلقات کے ساتھ ساتھ چین پاکستان کو اس کی ایٹمی تنصیبات کی حفاظت کے لئے معاونت بھی فراہم کرتا رہا ہے۔ لیکن حالیہ عرصے میں چین کے رویے میں کچھ تبدیلی آئی ہے اور اب نہ صرف پاکستان کی مدد میں اس کی جانب سے اتنی فراخ دلی برقرار نہیں رہی بلکہ وہ بعض معاملات میں دباؤ کی پالیسی پر بھی کاربند رہا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے لال مسجد کے واقعہ میں جب کچھ انتہاپسندوں نے اسلام آباد میں چینی عورتوں کو اغوا کر لیا تو چین نے جنرل مشرف پر ان کی فوری رہائی کیلئے دباؤ ڈالا۔

لیکن دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات کے حوالے سے چین کی تشویش کی سب سے بڑی وجہ Uigher کے علاقے میں ہونے والے احتجاجی مظاہرے اور سنکیانگ میں اسلامی شدت پسندی کی لہر ہے۔ چین اپنے ملک کے ان واقعات کیلئے پاکستانی انتہاپسند گروپوں کو ذمہ دار سمجھتا ہے اور اسے خاص طور پر "Uighur Etim" نامی چینی شدت پسند گروپ اور پاکستانی گروپوں کے رابطوں پر تشویش ہے۔ چین کی اس تشویش کا ایک براہ راست نتیجہ چینی صدر ہوجن تاؤ اور امریکی صدر اوباما کے نومبر ۲۰۰۹ء کو بیجنگ میں ایک مشترکہ بیان کی صورت میں سامنے آیا، جس میں دونوں ملکوں نے انسداد دہشت گردی اور پاکستان وافغانستان میں استحکام لانے کیلئے مشترکہ کوششوں پر زور دیا۔

جنوبی ایشیا میں چین کے اہم کردار کا امکان:

چین مستقبل میں اپنے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو کیسے استعمال کرے گا؟ گوادر بلوچستان میں چین کی جانب سے بندرگاہ کی تعمیر ایک اہم جیو پولیٹیکل قدم ہے، جس کے ذریعے وہ بحر ہند میں بھارت کے مقابلے میں طاقت کا توازن قائم کر سکتا ہے اور اسے خلیجی ممالک کے تیل تک آسان رسائی بھی حاصل ہو سکتی ہے، لیکن اس کے باوجود بھی چین کو بحر ہند سے ہرمز اور وہاں سے انڈونیشیا کے پانیوں تک توانائی کے وسائل کی فراہمی میں رکاوٹ کا اندیشہ ہے، جس کے باعث وہ چاہتا ہے کہ ایران اور مشرق وسطیٰ سے پاکستان کے زمینی راستے کے ذریعے اپنی سرحد تک توانائی کی فراہمی ممکن بنائی جائے۔

چین اس وقت جنوبی ایشیا میں ایک اہم مقام رکھتا ہے، ایک جانب وہ پاکستان کے

گہرے اور دوستانہ تعلقات رکھتا ہے، تو دوسری طرف بھارت کے ساتھ اس کے تعلقات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، جبکہ افغانستان میں اسکے سیاسی تعلقات اور بڑھتی ہوئی سرمایہ کاری کے باعث چین آئندہ عشرے میں جنوبی ایشیا میں ایک اہم طاقت کا درجہ حاصل کرلے گا۔ چونکہ چین کی ترقی اسے ایک عالمی طاقت کے طور پر اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں مددگار ثابت ہو رہی ہے، اس لیے وہ افغانستان میں قیام امن کے سلسلے میں بھی اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ یعنی علاقائی استحکام کیلئے وہ ایک طرف اپنے قدیم دوست پاکستان پر اثر انداز ہوگا تو دوسری جانب بھارت سے بڑھتے تعلقات کے باعث وہ پاک بھارت تعلقات پر بھی مثبت اثر ڈال سکتا ہے۔ چین پاک افغان سرحدی علاقے میں امن و استحکام کا خواہاں ہے۔ بصورت دیگر اسے پاکستان سے پھیلنے والی انتہاپسندی کے اپنے علاقوں تک آنے کا خطرہ ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ چین اپنے پچھواڑے میں امریکی موجودگی سے بھی خوش نہیں ہے، اور اسی وجہ سے علاقے میں اس کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ بار بار چین کو یہ یقین دہانی کرتا ہے کہ وہ افغانستان میں اپنی فوج کو طویل مدت تک رکھنے کا خواہشمند نہیں ہے اور یہاں سے انتہاپسندی، تشدد اور دہشت گردی کے خاتمے کی صورت میں وہ اپنی فوج جلد از جلد یہاں سے نکال لے گا۔

باب 8

پاک امریکہ تعلقات

پاک امریکہ تعلقات کے اتار چڑھاؤ سے سبھی واقف ہیں۔۱۹۵۰ء میں سرد جنگ کے زمانے سے شروع ہونے والی دونوں ملکوں کی پارٹنر شپ کئی بار بنی اور بگڑی، لیکن ان تعلقات میں سب سے اہم موڑ اس وقت آیا جب ۱۹۸۰ء کے عشرے میں دونوں ملکوں نے افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف مشترکہ جنگ لڑی۔اس کے بعد ۱۱/۹ نو گیارہ کے بعد بھی ایسے حالات پیدا ہوئے جب پاکستان کو امریکی دباؤ کے تحت اپنی پالیسی میں مکمل تبدیلی کر کے امریکہ کا ساتھ دینا پڑا۔دونوں ملکوں کے تعلقات میں کشیدگی کے کئی نقصانات ہوئے، خصوصاً ۱۹۸۹ء میں سوویت یونین کی شکست کے بعد جب امریکہ اس خطے سے چلا گیا تو یہاں طالبان پیدا ہو گئے۔اس سے پاکستان میں یہ سوچ پیدا ہوئی کہ امریکہ صرف اچھے وقت کا دوست ہے، دوسری جانب امریکہ کو پاکستان سے شکوہ ہے کہ اس نے انتہاپسند تنظیموں کو مدد دی اور اپنے ایٹمی راز افشا کر کے دھوکہ دہی کا مرتکب ہوا۔

۲۰۰۱ء سے پاکستان کے ساتھ امریکہ کے بہت سے اہم مفادات وابستہ ہیں، ان میں سے بعض پہلے بھی تھے لیکن اب ان کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

۱۔ ایٹمی پھیلاؤ

۲۔ پاکستان و بھارت کے درمیان اختلافات کی شدت ۲۰۰۱ء میں پیدا ہونے والی کشیدگی کے سبب عروج پر پہنچ گئی تھی، جسے امریکہ نے بات چیت کے ذریعے ختم کیا۔

۳۔ القاعدہ اور افغان طالبان کو پاکستان میں محفوظ پناہ گاہیں حاصل کرنے سے روکنا، یہ عناصر ان پناہ گاہوں کو ایک طرف افغانستان میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں پر حملوں اور دوسری طرف امریکہ و یورپ پر حملے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ ایٹمی ہتھیاروں سے لیس پاکستان کی اپنی اندرونی سلامتی کو بھی انتہاپسندوں سے خطرہ ہے۔

ان امریکی مفادات پر متعدد عناصر اثر انداز ہوتے ہیں، امریکہ افغانستان میں اپنی پالیسی کے ذریعے ان تمام مسائل سے نمٹتا ہے (سوائے ایٹمی مسئلے کے)۔افغانسان میں امریکی پالیسی سے پاکستان کے بارے میں اس کی پالیسی اور اس کی سلامتی کے بارے میں امریکی خواہشات کا اندازہ لگا جا سکتا ہے۔

کیا الیف۔پاک Af-Pak کی اصطلاح غلط ہے؟

یہ اصطلاح صدر اوباما کی جانب سے اعلان کردہ پالیسی سے وجود میں آئی جس میں جنگ سے متعلق اصل فریقوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور اسے جنوبی ایشیا کے وسیع تناظر سے الگ رکھا گیا ہے جس سے بھارت بھی اثر انداز ہوتا ہے۔اس میں پاکستان کی شمولیت امریکہ کی جانب سے پاکستان کو اپنے وسیع تر مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کرنے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ان میں ۱۹۵۰ء میں سوویت کمیونزم کے خلاف اتحاد کی تشکیل اور ۱۹۷۰ء میں چین سے رابطوں کے علاوہ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جنگ اور نائن الیون کے بعد دہشت گردی کی عالمی لڑائی میں پاکستان کا تعاون شامل ہیں۔اب امریکہ اور عالمی برادری کو افغانستان میں استحکام کیلئے پاکستان کی ضرورت ہے۔لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان اوباما سٹریٹیجی پر عملدرآمد کیلئے امریکہ کی مدد کو اپنے لیے اہم نہیں سمجھتا اور یہیں سے دونوں ملکوں کے درمیان اختلافات کا آغاز ہوتا ہے۔

افغانستان میں امریکی پالیسی:

امریکہ کی موجودہ پالیسی دو انتہاپسند نقطہ ہائے نظر کے درمیان بنائی گئی ہے، یعنی ایک نقطہ نظر کے حامل افغانستان میں ایک مکمل جنگ کے خواہاں ہیں اور دوسری جانب وہ جو چاہتے ہیں کہ امریکہ اور نیٹو افواج فوری طور پر اس علاقے سے واپس چلی جائیں۔صدر اوباما نے دسمبر ۲۰۰۹ء میں افغانستان میں تیس ہزار فوجیوں کے اضافے کا اعلان کیا تا کہ ان اقدامات سے افغان

طالبان کو جنگی نقصانات کے ذریعے مذاکرات کی میز پر آنے کیلئے مجبور کیا جا سکے، جس سے افغانستان میں ایک قابل عمل غیر طالبان حکومت کی جگہ پیدا ہو جائے گی۔(۷۰) امریکی انتظامیہ کو امید ہے کہ پاک امریکہ تعلقات کے حوالے سے یہ کم از کم خراب پالیسی ہے اور اس سے پاکستان کی سلامتی واستحکام میں بھی مدد ملے گی۔(۷۱)

پاکستان کو یہ خطرہ تھا کہ امریکہ اور نیٹو افواج کے مکمل انخلاء کے بعد امریکہ اور پاکستان کی فوج کے درمیان اس مسئلے پر اختلاف پیدا ہو سکتا ہے کہ افغان طالبان اور کوئٹہ وشمالی وزیرستان میں ان کے حامیوں سے کس طرح نمٹا جائے۔ موجودہ امریکی پالیسی اوباما سرج (Obama Surge) سے بھی یہ اختلاف پیدا ہونے کا امکان موجود ہے۔(۷۲) افغانستان میں امریکہ کی کامیاب جنگ کی صورت میں افغان طالبان کو پاکستانی سرحد کی جانب فاٹا میں دھکیلا جا سکتا ہے۔ جس کے بعد امریکہ اور نیٹو پاکستان کو ان کے خلاف آپریشن پر مجبور کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے نتیجے میں پاکستان میں اپوزیشن جماعتوں کی جانب سے حکومت پر یہ دباؤ آ سکتا ہے کہ وہ افغانستان میں امریکہ کی جنگ لڑ رہا ہے۔ (یہ دباؤ پاکستان کے فوجی افسروں کی جانب سے بھی آ سکتا ہے جو مسلمانوں کے خلاف جنگ کو ناپسند کرتے ہیں)۔

متبادل منظرنامہ، افغانستان میں امریکہ کی معمولی موجودگی:

اس متبادل پالیسی کو صدر اوباما نے اختیار نہیں کیا۔ اس پالیسی کا آغاز افغانستان سے نیٹو فوجوں کے فوری انخلاء سے ہوگا اور بدترین صورت کرزئی حکومت کی جگہ طالبان حکومت کا قیام ہو سکتا ہے۔ افغانستان میں امریکہ اور نیٹو کی ناکامی سے القاعدہ کو بہت بڑی نفسیاتی فتح حاصل ہو گی۔ (ایسی صورت میں نیٹو کے مستقبل پر بھی سوالیہ نشان لگ جائے گا) اور اس کے نتیجے میں پاکستان کے قریب سرحدی علاقوں میں افغان طالبان دوبارہ کنٹرول حاصل کر سکتے ہیں۔ اوباما سٹریٹیجی کو بھی ۲۰۱۱ء میں امریکی ونیٹو افواج کی تعداد میں کمی کر کے اس متبادل پالیسی سے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اوباما کے اٹھارہ ماہ میں فوجوں کی واپسی کے منصوبے سے (اگرچہ یہ کوئی حقیقی مدت نہیں) ایک بدترین نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ پاکستانی حلقے امریکی فوج کی واپسی کے پیش نظر افغان طالبان اور خصوصاً شمالی وزیرستان کے حقانی نیٹ ورک کی مسلسل مدد کرتے رہیں۔

آئی ایس آئی بطور ثالث:

اوباما سٹریٹیجی پاکستان اور امریکہ کے تعلقات پر کس طرح اثر انداز ہو گی؟ اگر امریکہ پاکستانی حکومت سے فوج اور آئی ایس آئی کے ذریعے امریکہ اور طالبان کے درمیان رابطے کا کردار ادا کرنے کیلئے کہے تو اس سے دونوں ملکوں کے تعلقات پر بہت مثبت اثر پڑ سکتا ہے۔ اس صورت میں افغان طالبان کو بھی فائدہ ہوگا کہ اس طرح انہیں آئی ایس آئی کی سفارتی مہارت اور مشورے بھی میسر ہو سکیں گے (جس کی انہیں شدید ضرورت ہے)(۷۳)۔ اگر پاکستان افغان طالبان اور نیٹو کے درمیان رابطے کا کردار ادا کرتا ہے تو یہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں پاکستان کے اسی کردار سے مشابہہ ہوگا جو اس نے امریکہ اور چین کے درمیان ادا کیا تھا، جب ہنری کسنجر نے پاکستان کے ذریعے چین تک رسائی حاصل کی تھی۔

اگر اوباما سٹریٹیجی قابل عمل ثابت ہوتی ہے جس سے افغان حکومت ملک کے زیادہ تر حصے میں استحکام لانے میں کامیاب ہو جاتی ہے (سوائے چند مقامات کے جہاں طالبان چھپے ہوئے ہوں) تو اس صورت میں پاکستانی طالبان بھی ختم ہو جائیں گے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ طالبان کو نہ تو شکست ہو سکتی ہے اور نہ وہ فتح یاب ہوتے ہیں اور افغانستان مختلف لسانی، نسلی اور قبائلی گروپوں کے قبضے میں آجاتا ہے، جو سب بیرونی قوتوں کی مدد کے محتاج ہوں، تو اس صورت میں کابل میں ایک کمزور حکومت قائم ہو گی۔ دیکھا جائے تو یہ بھی کوئی زیادہ خراب امکان نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں طالبان طاقت کا توازن برقرار رکھنے کیلئے افغانستان ہی میں محدود رہیں گے اور ان کا زیادہ وقت شمالی اتحاد اور دیگر لسانی گروپوں کے ساتھ لڑائی میں صرف ہوگا اور پاکستان اس مسئلے سے خاصی حد تک الگ رہے گا۔

اگر نیٹو افواج کے انخلاء کے بعد افغانستان میں مختلف گروپوں کی ملی جلی حکومت کی جگہ طالبان برسر اقتدار آ جاتے ہیں جیسا کہ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ہوا تھا تو اس کے ساتھ لاتعداد مخالف افغان گروپ بیرونی امداد کے ساتھ میدان میں آ جائیں گے۔ ایسی صورت میں پاکستانی طالبان بھی فائدہ اٹھا کر حکومت پاکستان کے خلاف اپنی کارروائیاں زیادہ شدت کے ساتھ کریں گے کیونکہ ان حالات میں انہیں امید ہو گی کہ اب وہ حکومت پاکستان کو شکست دے کر

خود کنٹرول حاصل کر کے اپنا ایجنڈا مسلط کر سکتے ہیں۔ چونکہ افغان طالبان کی فتح اور نیٹو کی شکست کا امکان بہت کم ہے اس لیے اس کے نتیجے میں پاکستان میں طالبان کے طاقت پکڑنے کا امکان بھی نہیں ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ افغانستان میں طالبان اور دیگر گروپوں کی ملی جلی حکومت کی صورت میں پاکستانی فوج مقامی طالبان کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرے گی؟ علاقے سے نیٹو کی واپسی کی صورت میں پاکستانی فوج پر طالبان کے ساتھ لڑائی کے لیے دباؤ برقرار نہیں رہے گا جس کے سبب فوج اور طالبان کے درمیان ایک پائیدار معاہدہ طے پا جانے کا امکان ہے۔(۷۴) علاقے سے امریکی اثر و رسوخ میں کمی اور نیٹو فوجوں کے انخلاء کے بعد اگر پاکستان میں ڈرون حملے جاری رہے اور ان کے نتیجے میں امریکی مخالفت بھی جاری رہی تو اس صورت میں پاک فوج طالبان کے ساتھ قدرے مختلف طریقے سے ڈیل کر سکتی ہے۔ کہ جہاں ممکن ہوگا وہاں معاہدہ کر لیا جائے گا اور اگر خودکش حملے جاری رہتے ہیں (خصوصاً بڑے شہروں میں) تو طالبان کے خلاف طاقت کا استعمال کیا جائے گا۔ لیکن اس بات کا امکان بھی ہے کہ پاکستانی فوج طالبان کے خلاف مکمل کریک ڈاؤن کا فیصلہ کر لے، خصوصاً ان حالات میں جب افغان طالبان اپنے ملک میں طرح طرح کی نسلی و لسانی لڑائیوں میں الجھے ہوئے ہوں گے۔

منفی صورتحال سے بچنے کی ضرورت:

ایک سینئر پاکستانی فوجی افسر نے اس مصنف کو بتایا کہ "پاکستان کی جانب سے ڈرون حملوں کی اجازت یا رضامندی صرف قبائلی علاقے تک محدود ہے اور اس کے علاوہ دیگر علاقے خصوصاً بلوچستان ڈرون حملوں کیلئے ریڈ لائین کی حیثیت رکھتے ہیں، جبکہ امریکی فوج کے پاکستان آنے یعنی Boots on the ground کے لئے سارا ملک ریڈ لائین ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ان ریڈ لائینوں کو عبور کرنے سے نہ صرف منفی عوامی ردعمل کا سامنا کرنا پڑے گا جس سے حکومت اور فوج پر دباؤ میں اضافہ ہوگا اور بلوچستان کا مسئلہ حل کرنے کیلئے اسلام آباد کی کوششوں کو دھکا لگے گا جو این ایف سی ایوارڈ کی مدد سے صوبے کے حالات بہتر بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ (اس ایوارڈ میں صوبوں کو وسائل میں زیادہ حصہ دیا گیا ہے) اس کے علاوہ امریکی کارروائی

سے بھارت کو بھی یہ غلط پیغام جائے گا کہ کشیدگی کی صورت میں بھارت کی سرحد پار زمینی یا فضائی کارروائی قابل قبول ہے۔ اگر امریکہ پاکستانی فوج پر پاکستان میں موجود افغان طالبان کے خلاف کارروائی کیلئے دباؤ کم کر دے تو ممکن ہے کہ جواب میں پاکستانی فوج افغانستان کے اندر افغان طالبان کی حمایت میں کمی کر دے۔(۷۵)

آئندہ حالات کا جائزہ لیا جائے تو پاک افغان سرحد کے دونوں جانب طالبان کے ساتھ معاملات طے پا جانے کی صورت میں بھی پاکستان اور امریکہ کے درمیان کشیدگی جاری رہے گی، کیونکہ امکان یہی ہے کہ طالبان اپنے زیر قبضہ علاقوں میں القاعدہ اور دیگر عالمی دہشت گردوں کو پناہ گاہیں اور تربیت گاہیں فراہم نہ کرنے کے اپنے معاہدوں سے پھر جائیں گے۔ دہشت گردوں کی ان کمین گاہوں کی وجہ سے ڈرون حملوں، یو ایس سپیشل آپریشن فورس اور امریکی دھمکیوں میں اضافہ ہوگا جس سے اسلام آباد کی حکومت مزید مشکلات اور تنہائی کا شکار ہوگی۔ اور اگر اسلام آباد کو یہ احساس ہوا کہ کابل میں طالبان مخالف اور شمالی اتحاد کی حکومت بننے کے امکانات بڑھ رہے ہیں تو اس سے پاکستانی فوج کی جانب سے ۱۹۹۰ء کی طالبان حمایت پالیسیوں کو اپنائے جانے کے جذبات پیدا ہوں گے۔

پاک امریکہ تعلقات کے ذریعے پاک بھارت تعلقات معمول پر لانے کی کوشش:

افغانستان میں پاکستان و امریکہ کے درمیان اختلافات سے پیدا ہونے والی کشیدگی کم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ امریکہ پاک بھارت تعلقات کی بہتری کو اپنی پالیسی کا حصہ بنا لے۔(۷۶) اگرچہ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستانی فوج بھارت کے ساتھ کشیدگی برقرار رکھنا چاہتی ہے تاکہ اس کے مفادات کا تحفظ ہو سکے اور اس کی منفرد حیثیت برقرار رہے۔ اس کے علاوہ پاکستانی فوج ہندو بھارت کے مقابلے میں مسلم پاکستان کے تحفظ کا تصور بھی برقرار رکھنا چاہتی ہے جس کے نتیجے میں وہ ملک کا سب سے طاقتور ادارہ بن چکی ہے۔ لیکن اب بہت سے پاکستانی یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ان کا معاشی مستقبل بھارت اور افغانستان کے ساتھ الجھے رہنے میں نہیں ہے، بلکہ انہیں اپنے ملک کی زبردست جغرافیائی حیثیت کا فائدہ اٹھا کر معاشی و تجارتی فوائد حاصل کرنے چاہئیں، کیونکہ پاکستان خلیج، سنٹرل ایشیا، جنوبی اشیاء اور جنوب مشرقی

ایشیاء کے درمیان واقع ہونے کے سبب زبردست فوائد حاصل کر سکتا ہے۔اور جنوبی ایشیا میں استحکام قدرتی طور پاکستان کے فائدے میں ہےاس علاقے کے بارے میں امریکہ کی سٹریٹیجک سوچ بھی یہی ہے۔

کیری لوگر برمن امدادی پروگرام پر عملدرآمد:

اس امدادی پروگرام پر عمل درآمد سے پاک امریکہ تعلقات میں ایک نئی جہت کا اضافہ ہوا ہے۔(یہ امدادی رقم فوجی امداد کے علاوہ دی جائے گی)اس بل کے تحت اگر امریکہ کو یہ محسوس ہوا کہ امدادی رقم کو غلط یا غیر موثر طریقے سے استعمال کیا جارہا ہے تو کانگریس کی جانب سے پروگرام پر عملدرآمد میں کمی کر دی جائے گی۔اس سے پاکستان میں اس خیال کو تقویت ملے گی کہ امریکہ صرف اچھے وقت کا دوست ہے۔امدادی بل میں استعمال کی جانے والی ناخوشگوار زبان پر پاکستانی فوج اور دیگر بالا دست طبقے پہلے ہی شدید تنقید کر چکے ہیں (۷۷)۔اگر اس بڑے امدادی پروگرام سے امریکی کانگریس اور عوام کو واضح نتائج حاصل نہیں ہوتے تو اس سے دونوں ملکوں کے تعلقات میں مزید خرابی اور شکایات میں اضافہ کا امکان ہے۔اس پروگرام پر عملدرآمد حکومت کے اداروں کی بجائے این جی اوز کے ذریعے کیا جائے گا اور مقامی این جی اوز (غیر سرکاری تنظیموں) میں بدعنوانی اور وسائل کے ضیاع کا خاصا رجحان پایا جاتا ہے۔(۷۸) اخراجات کی اکاؤنٹنگ اور آڈٹ وغیرہ کے ذریعے اس مسئلے کو بہتر کیا جا سکتا ہے۔

پاکستانی فوجی اور حکومت کا استحکام،سب سے اہم امریکی مفاد:

پاکستان میں امریکہ اور برطانیہ کے مفادات پر مسلسل زد پڑ رہی ہے کیونکہ پاکستانی معاشرے میں امریکہ کی مخالفت اور اسلامی شریعت کی جانب رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے۔برٹش کونسل کے ایک حالیہ سروے کے مطابق پاکستانی نوجوانوں کی پانچ گنا زیادہ تعداد نے خود کو پاکستانی کے مقابلے میں ایک مسلمان کے طور پر شناخت کرایا،اور اس معاشرے کی عکاسی اس نوجوان فوجی جوان سے ہوتی ہے جو اس طرح کے شدت پسند ماحول سے نکلا ہو۔جب امریکہ پاکستان کو افغان طالبان کی مدد اور آئی ایس آئی کو ڈبل گیم کھیلنے سے منع کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اوباما سٹریٹیجی پر عملدرآمد کے ذریعے افغانستان کے استحکام کی بات کر رہا ہے۔لیکن اس پر

پاکستانی فوج میں کیسے عمل درآمد کرایا جائے گا؟ فوج کے اندر سیکولر/اسلام پسند اور امریکہ مخالف یا امریکی حامیوں کی تقسیم کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے۔لیکن کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ فوج میں نظم وضبط اور فوجی افسروں میں ترقی کے معاشی فوائد کے حصول کی خواہش کافی شدت سے پائی جاتی ہے،اس لئے امریکہ کی جانب سے بلوچستان میں ڈرون اور زمینی حملوں کے طویل سلسلے کے بعد ہی فوج میں کوئی بحران پیدا ہو سکتا ہے۔ایک خیال یہ ہے کہ امریکہ اور نیٹو کے مفادات کو پاکستانی فوج میں یکجہتی برقرار رکھ کر زیادہ بہتر طریقے سے پورا کیا جا سکتا ہے،بجائے اس کے کہ پاکستانی فوج کو افغانستان میں امریکی پالیسی کی حمایت پر مجبور کیا جائے جسے وہ محض نیٹو کی تنگ نظر پالیسی سمجھتی ہو۔(۷۹) بہت سے پاکستانی یہ سمجھتے ہیں کہ امریکی دباؤ کے نتیجے میں افغان طالبان کے خلاف بلوچستان اور فاٹا میں نئے محاذ جنگ کھول کر پاکستان کو ایک لامحدود جنگ کی جانب دھکیلا جا رہا ہے۔

اگر افغانستان میں اوباما پالیسی کے نتیجے میں پاکستانی فوج اور معاشرے میں انتشار کو روکا جا سکے تو اس بات کے امکانات موجود ہیں کہ فوج میں یکجہتی برقرار رہے گی اور ملک کے حالات بھی کچھ بہتر ہو سکیں گے۔جب واشنگٹن یہ کہتا ہے کہ ایف پاک منظرنامے میں اس کیلئے سب سے اہم سٹریٹیجک مقصد پاکستان کا استحکام اور سلامتی ہے تو پھر امریکی پالیسیوں کا مطمع نظر پاکستانی ریاست اور فوج کی یکجہتی ہونا چاہیے۔امریکہ میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے حوالے سے بہت تشویش پائی جاتی ہے اور آئندہ بھی رہے گی کہ کہیں یہ ملک کسی بدترین انتشار کی جانب نہ چلا جائے اور ملک اور فوج کی سلامتی خطرے میں نہ پڑ جائے۔پاکستان کے بارے میں طویل المدت پالیسی تشکیل دیتے ہوئے واشنگٹن کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ ایسے حالات پیدا نہ ہونے پائیں۔

اختتام

آئندہ ایک سے تین سال کے عرصے میں پاکستان کو مختلف متوقع اور غیر متوقع چیلنجز کا سامنا ہوسکتا ہے۔

۱۔ چند متوقع خدشات میں ملک کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے مسائل، معاشی مسائل، پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں خرابی اور کیری لوگر امدادی پروگرام سے پیدا ہونے والے سیاسی مسائل سرفہرست ہیں۔

۲۔ غیر متوقع خدشات میں غذائی بحران یا اسی شدت کا کوئی اور مسئلہ جس سے پاکستان کی منتخب حکومت کا خاتمہ ہو جائے، افغان جنگ کے نتیجے میں امریکہ پر پڑنے والا کوئی گہرا اثر (جو موجودہ ممکنہ مسائل سے ہٹ کر ہو مثلاً کرزئی حکومت کی غیر متوقع مضبوطی یا پھر جنگ سے کوئی شدید نقصان، جس سے امریکہ اور نیٹو کو فوری انخلاء پر مجبور ہونا پڑے) دیگر غیر متوقع چیلنجز میں پاک بھارت جنگ اور پنجاب میں طالبان کا کوئی بڑا حملہ شامل ہوسکتا ہے۔

متوقع خدشات کی صورت میں ملک جیسے تیسے حالات سے نکل جانے کی پوزیشن میں ہو گا، لیکن غیر متوقع چیلنج کی صورت میں آئندہ ایک سے تین سال کی مدت کے بارے میں بھی کوئی پیشن گوئی کرنا بہت مشکل ہوگا۔

ماضی میں بھی چند لوگ ہی غذائی اور توانائی کے بحران، مالاکنڈ ڈویژن اور سوات میں طالبان کی شدت اور ممبئی حملوں اور طالبان کے مسئلے پر فوج کے فیصلوں کے بارے میں اندازہ لگا

سکتے تھے۔

یعنی ان تمام تجربات کے ساتھ یہی امکان ہے کہ پاکستان جیسے تیسے ان حالات سے نکل جائے گا، حالات تھوڑے زیادہ خراب بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن کوئی بڑا دھچکا نہ لگنے کی صورت میں پاکستان ناکام ریاست ثابت نہیں ہوگا۔

پاکستانی فوج خاصی مضبوط ہے اور ملک میں اس پر بھروسہ بھی کیا جاتا ہے، اگر فوج واقعی چاہے تو یہ اندرونی سلامتی کے مسائل سے مکمل تو نہیں مگر کافی اچھی طرح نپٹ سکتی ہے۔ امریکہ بھی پاکستان کی سلامتی کا خواہاں ہے اور اس کی پاکستان حکومت اور فوج کے ساتھ گہری شراکت قائم ہے، اس صورت میں امریکہ عالمی معاشی اداروں مثلاً آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور عارضی ڈونرز گروپ جیسے 'فرینڈز آف ڈیموکریٹک پاکستان' پر اپنے اثر و رسوخ کے باعث پاکستان کو کسی بڑے معاشی یا سیاسی بحران سے بچنے میں مدد دے سکتا ہے۔ پاکستان کو ماضی کی طرح ان حالات سے بھی نکل جانا چاہیے۔

☆☆☆

حواشی

۱۔ بلوچستان میں جاری بدامنی کے حوالے سے فوج، پشتونوں اور بلوچوں کے درمیان اس پیچیدہ تعلق کی نشاندہی پروفیسر اناطول لیون (Anatol Lieven) نے کی ہے، گفتگو ۱۷ دسمبر ۲۰۰۷ء لندن)

۲۔ دیکھئے، پاکستان کی اگلی نسل، رپورٹ برٹش کونسل، نومبر ۲۰۰۹ء ویب ایڈریس
http///graphicsof nytimes.com/package/pdf/world/2009 1122-pstan.pdf.
مزید دیکھئے، سبرینا ٹیورنائز، سروے آف پاکستان
Young people predicts disaster, if their needs are not addressed". The New York Times, Nov. 22, 2009 at www.nytimes.com/2009/11/22/world/asia/22 pstan.html!eml=etal

۳۔ آبادی کے طویل مدتی اندازوں کے مطابق پاکستان کی آبادی ۲۰۳۰ء تک ۲۵ کروڑ اور ۲۰۵۰ تک تیس کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ اقوام متحدہ پاپولیشن ڈویژن ۲۰۰۷ء ورلڈ پاپولیشن پروسپیکٹ ۲۰۰۶ء، اقوام متحدہ نیویارک

۴۔ ڈاکٹر سلمان شاہ "معیشت ترقی کی راہ میں" غیر شائع شدہ اکتوبر ۲۰۰۸ء

۵۔ شاہد، ابڈ (bid) ای میل، ۱۸ دسمبر ۲۰۰۹ء

۶۔ ملک میں بیرونی سرمایہ کاری خاص طور پر خلیجی ریاستوں سے آئی کیونکہ حکومت نے سرکاری بینکوں کے اثاثے فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔

۷۔ ہارلان المانی (Harlan Ullman) "روشن کرن"، آلوز اینڈ ایگلز، (Owls and Eagles) ۲۶، اگست ۲۰۰۹ء

۸۔ کنٹری رپورٹ ان پاکستان، اکنامک انٹیلی جنس یونٹ، ستمبر ۲۰۰۹ صفحہ نمبر ۳

۱۰۔ آئی ایم ایف پاکستان پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ نئے شعبوں سے ٹیکس وصول کیا جائے۔ ملک میں زراعت اور دیگر شعبوں سے نہ ہونے کے برابر ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ اگرچہ کم شرح ترقی کے باعث زیادہ ٹیکس پر تنقید کی جا سکتی ہے لیکن وسط مدتی اور طویل مدتی بنیاد پر زیادہ ٹیکس سے تعلیم اور صحت کیلئے زائد رقم مل سکتی ہے جو طویل المدت ترقی کیلئے بے حد ضروری ہے۔

۱۱۔ پاکستان کیلئے کاؤنٹر سائیکل پالیسی اپنانے سے اس لئے گریز کیا گیا کیونکہ جب پاکستان نے آئی ایم ایف سے رجوع کیا تھا تو اس وقت پاکستان کے اثاثے تیزی سے ختم ہو رہے تھے، بھارت کے برعکس پاکستان کے پاس معاشی خسارہ کم کرنے کیلئے متبادل ذرائع بھی موجود نہیں تھے۔ پاکستان کے بدترین بجٹ خسارے اور افراط زر کی وجہ سے آئی ایم ایف نے پاکستان میں سرمائے کی کمی کی وجہ سے شرح سود کو کم نہیں کیا جا سکا۔ اس وقت حکومت پاکستان کے پاس صرف دو بیرونی فنڈ یعنی آئی ایم ایف اور ٹوکیو ڈونر پیکج ہی موجود تھے، اتنی کم (لیکوڈیٹی) کی وجہ سے آئی ایم ایف ۹۔۴ فیصد سے زیادہ خسارے کی اجازت نہیں دے گا کیونکہ درحقیقت یہ خسارہ ۶ فیصد تک پہنچ جاتا ہے۔

۱۲۔ پاکستانی ٹیکسٹائل میں اضافے کی کافی گنجائش ہے اور امریکہ و یورپ کے ساتھ آزاد تجارتی معاہدے سے پاکستان کے تجارتی خسارے کو متوازن بنانے میں مدد ملے گی۔ بدقسمتی سے امریکی کانگریس میں پاکستان کو کم از کم رسائی فراہم کرنے کے مسئلے پر ٹیکسٹائل لابی کی جانب سے کافی مخالفت پائی جاتی ہے۔ نیویارک ٹائمز نے سات دسمبر ۲۰۰۹ء کو اپنے ایک مضمون "پاکستان اور جنگ" میں تجویز کیا کہ وائٹ ہاؤس کانگریس پر دباؤ ڈالے کہ وہ پاکستان کو خصوصی تجارتی رعایتیں دینے کیلئے قانون سازی کرے۔

۱۳۔ احتشام احمد، آئی ایم ایف، اٹلانٹک کونسل میٹنگ واشنگٹن ڈی سی، ۲۷ مارچ ۲۰۰۹ء اجلاس میں مستقبل میں بڑے پیمانے پر فارمنگ اور ساتھ ہی ساتھ چھوٹے کاشتکاروں کی شہروں میں منتقلی پر غور کیا گیا۔ سعودی عرب اور یو اے ای پاکستان میں وسیع قطعات اراضی کاشتکاری کیلئے لیز پر لینے پر غور کر رہے ہیں۔

۱۴۔ پاکستان کے دو بڑے شہر ہیں، ایک کروڑ ساٹھ لاکھ آبادی والا شہر کراچی اور ایک کروڑ لوگوں پر مشتمل لاہور شہر، جس کے بعد آبادی کے اعتبار سے دوسرے درجے کے شہر ملتان، فیصل آباد، راولپنڈی، پشاور اور کوئٹہ ہیں، جن کی آبادی چالیس سے پچاس لاکھ تک ہے۔ جبکہ دس لاکھ آبادی والے بارہ شہر تیسرے درجے میں آتے ہیں۔ دیہات سے آنے والے لوگوں کی بڑی تعداد انہی شہروں میں آباد ہو رہی ہے، جس سے آئندہ وقت میں یہ شہر مینوفیکچرنگ کے مراکز کی صورت میں ڈھل سکتے ہیں۔

۱۵۔ آئی پی آئی (IPI) اور ٹی اے پی آئی (TAPI) معاہدے اس وقت مختلف مراحل میں ہیں۔ آئی پی آئی کا معاہدہ ہونے کے امکانات کافی زیادہ ہیں۔ کم از کم پاکستان اور ایران کے درمیان یہ معاہدہ تقریباً طے ہے، جبکہ اس میں بھارت کی شمولیت کا مسئلہ ابھی طے نہیں پا سکا۔ اس کے امکانات کبھی پیدا ہو جاتے ہیں اور کبھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر بھارت اس معاہدے میں شامل نہیں ہوتا تو چین کے شریک ہونے کا امکان ہے، کیونکہ چین توانائی کی فراہمی کیلئے کسی زمینی راستے میں دلچسپی رکھتا ہے تاکہ بحری راستوں کی ناکہ بندی کا توڑ کر سکے (دیکھئے باب نمبر ۷ انفرا، Infra) پاکستان اور ایران کے درمیان گیس سپلائی کیلئے پچیس سالہ معاہدے کا امکان ہے۔

www.glgroup.com/news/IPI-not-yet-over-Iran-India-still-in-bed-with-each-other43430html. جبکہ ٹی اے پی آئی (TAPI) معاہدہ بالکل مختلف نوعیت کا ہے اور ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں ہے۔ اس پر عمل درآمد جنوبی افغانستان (ہلمند) کے ذریعے ہوگا۔ توانائی کے منصوبہ سازوں کے مطابق اس وقت یہ ایک خطرناک تجویز ہے۔

۱۶۔ TFR (ٹوٹل فرٹیلیٹی ریٹ) کے تحت فی عورت بچے پیدا کرنے کی عمر کا اندازہ لگایا جاتا ہے

۱۷۔ پچاس فیصد پاکستانی ناخواندہ ہیں جبکہ پاکستانی خواتین میں ناخواندگی کا تناسب دو تہائی ہے، (دیکھئے سنٹر فار امریکن پراگرس، "پارٹنرشپ فار پروگرس" نومبر ۲۰۰۸ء صفحہ ۵۰ اور ۵۱) فاٹا کے علاقے میں ستانوے فیصد خواتین، تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ (دیکھئے بلیری سائنوٹ، "دی ٹرانسفورمیشن آف پاکستان" ۱۵۵ (۲۰۰۹ء) صفحہ ۱۱۲)

۱۸۔ دیکھئے رچرڈ سنکوٹا (Richird Cincotta) "افغانستان کی آسمان کو چھوتی ہوئی شرح پیدائش

میں کمی آ رہی ہے جو ایک اچھی علامت ہے" www.foreignpolicy.com سولہ نومبر ۲۰۰۹ء، سنکوٹا نے نومبر ۲۰۰۹ء سنکوٹا کی ایک ای میل میں لکھا ہے۔ "جنوبی ایشیاء کی علامات" اگرچہ ترقی کے ضمن میں بعض معاملات میں ناکامی ہوئی، لیکن کچھ مبصرین اس کے چند مثبت پہلوؤں کو بھی دیکھتے ہیں۔ مثلاً بعض بھارتی ماہرین اپنے ملک میں پاکستان کی طرح کی بلند شرح پیدائش کو ایک دوسرے انداز میں دیکھتے ہیں۔ بھارتی ریاستوں بہار اور اتر پردیش (یوپی) میں بھی پاکستانی پنجاب کی مانند شرح پیدائش بہت زیادہ ہے (جسے وہ بھارت کا بھیانک خواب کہتا ہے) ان علاقوں میں آبادی میں تباہ کن اضافے اور غربت کی وجہ سے نکسل بغاوت کا خدشہ ہے (جو ماؤ نواز بغاوت سے ملتی جلتی ہے) اس کے باوجود بھی چند بھارتی ماہرین کا یہ خیال ہے کہ یہ نومولود بچے آئندہ نسل کے سوفٹ ویئر انجینئر اور ہنرمند مزدور بن سکتے ہیں۔

۱۹۔ اگرچہ دیہات سے آنے والے بے روزگار اور بے ہنر افراد کی شہروں میں آمد سے سیاسی استحکام کو خطرات لاحق ہیں لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دیہی علاقوں میں انتہاپسندی کے خطرات زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ وہاں مقامی امام مسجد کے مقابلے میں بہت کم متبادل نظریات ہوتے ہیں چاہے اس کے خیالات کتنے ہی پس ماندہ اور خونریزی پر مبنی کیوں نہ ہوں۔ گفتگو سید محمد، ...... پولیٹیکل رسک، آکسفورڈ جائزہ کانفرنس، ۱۷ ستمبر ۲۰۰۹ء

۲۰۔ EIU کنٹری رپورٹ پاکستان، ibid صفحہ نمبر ۳، گذشتہ مالی سال ۹۰۔۲۰۰۸ء کے مقابلے میں اس کی شرح ۷۔۳ فیصد کم ہے۔

۲۱۔ ۲۰۰۹ء کے آغاز میں پاکستانی معیشت کی حالت کے خلاصے کے بارے میں دیکھئے۔

urgent : Needed : A comprehensive us Policy Towards Pakistan

اٹلانٹک کونسل آف یونائیٹڈ سٹیٹس (فروری ۲۰۰۹ء) صفحہ ۲۰ تا ۲۳، رپورٹ کا مصنف ورکنگ گروپ کا ایک رکن ہے۔ رپورٹ پر نظر ثانی جاری ہے۔

۲۲۔ غیر یقینی سیاسی صورتحال کے باعث غیر ملکی سرمایہ کار ابھی تک پاکستان میں براہ راست سرمایہ کاری کے بارے میں گومگو کا شکار ہے، دیکھئے تبصرہ، جیکب لیو، نائب وزیر خارجہ، پاکستان میں سرمایہ کاری کے سلسلے میں درپیش مشکلات خصوصاً توانائی کے شعبے میں۔

ویب ایڈریس

www.state.gov/s/lmr/remakrs/2009/12915htm

کئی غیر ملکی کمپنیاں توانائی کے شعبے میں سرمایہ کاری کی خواہش مند ہیں لیکن وہ حکومت سے اس بات کی ضمانت چاہتی ہیں کہ انہیں مارکیٹ تک رسائی کا مناسب موقع دیا جائے گا اور توانائی کی مقامی کمپنیاں سیاسی اثر ورسوخ کے ذریعے انہیں پیچھے نہیں چھوڑ سکیں گی۔

۲۳۔ یہ زونز خصوصی علاقے ہوں گے جہاں پاکستان کے قبائلی علاقوں میں تیار کی جانے والی اشیاء امریکی منڈی میں ڈیوٹی فری لائی جا سکیں گی۔ (یہ مکمل طور آزاد تجارتی معاہدہ نہیں ہوگا) دیکھئے پارٹنر شپ فار پراگرس، پاکستان اور خطے میں استحکام اور خوشحالی کیلئے ایک نئی حکمت عملی کی جانب سفر، سنٹر فار امریکن پروگراسی، ۱۷ نومبر ۲۰۰۸ء صفحہ ۵۹۔

۲۴۔ دیکھئے، ولی نصر۔ Forces, Fortune and the Muslim Middle Class (2009)

۲۵۔ مشرف حکومت پر تنقید کرنے والوں کا کہنا ہے کہ فوجی حکومت نے ملکی معیشت کی غلط تصویر پیش کی اور اسے بڑھا چڑھا کر پیش کیا، کیونکہ امریکہ اس پر یقین کرتا تھا۔ اصل میں جب مشرف نے اقتدار سنبھالا تو ملک دیوالیہ ہونے کے قریب تھا، کیونکہ بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر بنا کر سرحدوں کو تجارت کے لئے کھولے بغیر کوئی بھی ایسا نہیں کر سکتا تھا اور فوجی ڈکٹیٹر ہونے کے باوجود یہ بات مشرف کے لئے بھی سیاسی طور پر ناممکن تھی۔

۲۶۔ آرمی کی پرموشنز کو سویلین کنٹرول میں لانے کا معاملہ زیادہ اچھا نہیں رہا، پیپلز پارٹی اور نواز شریف کی جانب سے اپنی پسند کے افسر لانے سے فوج میں سیاست بڑھی۔

۲۷۔ دیکھئے عائشہ صدیقہ کی کتاب "ملٹری آئی این سی Inc. ، پاک فوج کی اندرونی معیشت" (لندن پلوٹو پریس، ۲۰۰۷ء)

۲۸۔ زرداری کی قیادت کا ذکر بہت اہم ہے کیونکہ وہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس دوران ۱۶ دسمبر ۲۰۰۹ء کو سپریم کورٹ نے این آر او کے بارے میں فیصلہ کیا جس سے کئی وزراء کا استثنیٰ یا ان کے مقدمات پر معافی ختم کر دی گئی۔ اس فیصلے سے عدلیہ کے ذریعے سول اقتدار کی طاقت کا مظاہرہ ہوا۔ اس میں صدر زرداری کو حاصل غیر معمولی اقتدار اور اختیار کے معاملے میں کچھ اصلاحات کی گئیں۔ اس فیصلے کے بعد کئی وزراء نے استعفیٰ

دے دیا جس سے ممکنہ طور پر زرداری کی کمزور حکومت کو کچھ توانائی ملی۔ اب بھی حکومت میں کچھ ایسے طاقتور اور جرأت مند وزراء ہیں جو ٹیکس پالیسی اور انتظامیہ میں کچھ بنیادی تبدیلیوں کی کوشش کر رہے ہیں۔ دیکھیئے جین پیریز "پاکستان میں سیاستدانوں کیلئے معافی کا خاتمہ" نیویارک ٹائمز ۱۶ دسمبر ۲۰۰۹ء۔ www.nytimes.com

این آر او کے اختلافی مسئلے پر شجاع نواز نے بھی ایک فکر انگیز مضمون لکھا، "پاکستان میں فیصلے کا سال" نیو اٹلانٹسٹ، ۱۷ دسمبر ۲۰۰۹ء۔ www.acus.org/new.

۲۹۔ کراچی سے تعلق رکھنے والے بزنس مین شہزاد حسین بنگلہ دیش ماڈل کے بہت بڑے حامی ہیں کہ فوج کے ذریعے ٹیکنوکریٹ حکومت قائم کر دی جائے۔ انہیں یقین ہے کہ ایسی حکومت معاشی مسائل حل کر سکتی ہے۔ کیونکہ وہ سیاسی مسائل اور مجبوریوں کا شکار نہیں ہوتی اور کرپشن سے بھی بچی رہتی ہے جو سیاسی جماعتوں کو شدید نقصان پہنچاتی ہے۔ گفتگو، ۲۸ جولائی ۲۰۰۸ء لندن

۳۰۔ نئی ابھرنے والی مڈل کلاس میں جذبہ قومیت (نیشنلزم) اور اسلامی رجحانات بھی پیدا ہو رہے ہیں اور انہیں امریکہ پر بھی شدید شبہات ہیں۔ یہ طبقہ دائیں بازو کے میڈیا کے ذریعے کچھ باتوں کی دستاویزی وضاحتیں بھی چاہتا ہے۔ سبرینا ٹیورنائز، پاکستانی سیاست میں غیشلسٹ اثرات، نیویارک ٹائمز، ۲۰ نومبر ۲۰۰۹ء

www.nytimes.com/2009/11/20/asia/20 mood.html3hpw

۳۰۔ دیکھئے جوشوائی وائیٹ، پاکستان اسلامسٹ فرنٹیئر: اسلامک پالٹکس اینڈ یو ایس پالیسی ان پاکستان نارویسٹ فرنٹیئر ریلجن اینڈ سیکورٹی مونوگراف، سیریز ا

۳۱۔ جماعت کا ایک دھڑا سمیع الحق گروپ کہلاتا ہے (JUIS) لیکن یہ انتخابی سیاست کے حوالے سے کمزور سمجھا جاتا ہے۔

۳۲۔ دیکھئے، گلز کیپل، جہاد دی ٹریل آف پولیٹکل اسلام (چوتھا ایڈیشن ۲۰۰۶ء) صفحہ ۵۷۔۵۸

۳۳۔ صوبہ سرحد میں کامیاب ہونے والی مخلوط جماعت کا نام متحدہ مجلس عمل (MMA) تھا، جس کے معتدل مزاج وزیر اعلیٰ اکرم درانی نے پارٹی کے ملاؤں کو مطمئن کرنے

کیلئے داڑھی بڑھائی تھی۔

۳۴۔ مثال کے طور پر دیکھئے، بروس ریڈل ۔ Armegeddon in Pakistan, National interest, July/Aug. 2009

www.nationalinterest.org/Artical aspxd = 21644

۳۶۔ مختار مائی کا معروف گینگ ریپ کیس اس کی واضح مثال ہے۔قانونی نظام کی پیچیدگیوں کے باعث اس مقدمہ کا فیصلہ ابھی تک نہیں ہوسکا اور مجرم آزاد گھوم رہے ہیں۔دیکھئے۔

"Gang Rape for Honor". Reprinted. Dec. 17, 2009 at

www.boloji.com/wfs084.htm www.mulml.org/node/2083

۳۷۔ امریکہ کی خفیہ ایجنسیوں کیلئے تمام پنجابی اور پشتون جہادی انتہاپسند گروپوں کا ریکارڈ رکھنا ہی مشکل ہے نہ کہ وہ مزید چھوٹے چھوٹے آزاد گروپوں میں تقسیم ہو جائیں، جو نہ تو کسی نظم وضبط کے پابند ہوں اور نہ ہی ان کی کوئی خاص لیڈر شپ ہو۔ دوسری جانب یہ چھوٹے چھوٹے گروپ کسی مخصوص علاقے تک محدود نہیں رہتے اور لشکر طیبہ جیسے گروپوں کی بجائے عالمی جہادی مہم کا حصہ بن جاتے ہیں۔

۳۸۔ دیکھئے دوسرا اداریہ http//dailytimes.com.pk/defaultasp/page =2009/11/18/story-18-11-2009 pg 3-1

۳۹۔ بعض تجزیہ کاروں کا خیال ہے کہ صدر مشرف کی جانب سے لال مسجد کو انتہاپسندوں کے قبضے سے چھڑانے کیلئے فوج کے استعمال کے تحت فیصلے سے طالبان اور دیگر انتہاپسندوں کی جانب سے فوج کے خلاف کارروائیوں کا آغاز ہوا۔ان کا کہنا ہے کہ اس فیصلے سے فوج انتہاپسندوں کے فتووں اور حملوں کی زد میں آ گئی۔جس سے پاکستان کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔افضل امین (برطانوی فوج کے کیپٹن) کے ساتھ ملاقات، ۲۰ نومبر ۲۰۰۹۔

۴۰۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں ذوالفقار علی بھٹو اور ۲۰۰۵ء سے ۲۰۰۷ء کے دوران جنرل مشرف کے ادوار میں پنجاب کا غلبہ رکھنے والی فوج نے بلوچستان کے علیحدگی پسندوں کے خلاف مسلسل اور سخت آپریشن کیے۔ دیکھئے۔سلیگ ہیرسن، پاکستان میں بلوچ شورش۔ Le

Monde Deplomatique. Oct. 2006

۴۲۔ خوشحالی کے ضمن میں اس کی مثال اسرائیل میں رہنے والے عرب باشندوں (ان میں زیادہ تر اپنے آپ کو فلسطینی کہتے ہیں) کی مانند ہے، یعنی جس نظر سے وہ مغربی کنارے میں بننے والی ریاست فلسطین کو دیکھتے ہیں، اگر کبھی یہ ریاست وجود میں آئی تو ان میں سے بہت کم لوگ اسرائیلی شہریت اور اس کے فوائد چھوڑ کر فلسطینی شہری بننا پسند کریں گے۔

۴۳۔ بھارت کی جانب جھکاؤ اس طرح نقصان دہ ثابت ہوا کہ اس سے پاکستانی فوج، آئی ایس آئی اور افغانستان میں نیٹو کے خلاف لڑنے والے پشتون طالبان کے درمیان یگانگت پیدا ہوئی۔ایک جانب اے این پی اور سیکولر قوم پرست ہیں جبکہ ان کے مقابلے میں پشتون طالبان اور اسلامی گروپ ہیں۔بھارت کے حوالے سے دو الگ الگ پشتون روایتیں ہیں۔پہلی قوم پرستی کی کلاسیکل روایت ہے جس سے تعلق رکھنے والوں نے پاکستان بننے کی مخالفت کی تھی۔ان کا تعلق بھارتی کانگریس پارٹی سے تھا، یہ لوگ اب اے این پی میں ہیں، یہ عام پشتونوں کے مقابلے میں بھارت کی جانب رجحان رکھتے ہیں۔جبکہ دوسرا گروپ طالبان اور ان سے ملتے جلتے نظریات رکھنے والوں کا ہے۔ان لوگوں کو آئی ایس آئی نے استعمال کیا اور اب بھی کر رہی ہے۔یہ لوگ حکومت پاکستان کے مددگار ہیں کیونکہ ان کا ایجنڈا پاکستانی سیکورٹی اسٹیبلشمنٹ سے ملتا جلتا ہے۔پشتون قوم پرستی کی روایت اے این پی کے حوالے سے جانی جاتی ہے۔

۴۴۔ اس وقت مرکزی حکومت اور صوبوں کے درمیان وسائل کی تقسیم کے حوالے سے مذاکرات جاری ہیں۔جن سے صوبہ سرحد کو کئی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔تاہم اس سے زیادہ سے زیادہ خودمختاری کے لئے پشتون جدوجہد کا خاتمہ نہیں ہو سکے گا۔

۴۵۔ دیکھئے وزیراعظم گیلانی کا خطاب، ہم ماضی میں بلوچستان کو نظرانداز کرنے پر معذرت خواہ ہیں۔ڈان ۲۴ نومبر ۲۰۰۹ء، ویب ایڈ ریلیز

ww.dawn.com/wps/wcm/connect/dawn/content-liberary/
dawn/new/pakstan/04-balochistan package-95-10

۴۶۔ کچھ ماہرین پنجابیوں کی جانب غیر پنجابیوں کے عمومی غصے کو ایک اہم عنصر سمجھتے ہیں۔اب

فوج اپنی بھرتی میں غیر پنجابیوں کی شرکت کو بڑھا رہی ہے۔جس سے یہ ایک قومی ادارے کی شکل میں ڈھل جائے گی۔

۴۷۔ دیکھئے،اداریہ،پاکستان خطرے میں اضافہ،گارڈین،۹دسمبر۲۰۰۹ء
www.guardian.co.uk/commentsfree/2009/09/dec.Pakistan

۴۸۔ فارسی شمالی اتحاد کے تاجکوں کی زبان ہے(جو فارسی زبان سے ملتی جلتی ہے)

۴۹۔ دیکھئے حیدر ملک،پاکستان کے نئے طالبان،نیوزویک ۱۹ستمبر۲۰۰۹
www.newsweek.com/id/215759

۵۰۔ طالبان کی جانب سے کراچی کو سامان کی فراہمی کیلئے اپنا مرکز بنائے رکھنے کا امکان ہے اور وہ نہیں چاہیں گے کہ یہاں ۱۹۹۰ کی مانند پشتون اور مہاجر شورش شروع ہو جائے۔

۵۱۔ ایک گذشتہ مضمون میں 'مشرق وسطی میں انتہا پسند اسلام کا فروغ'' اس مصنف نے تجویز کیا ہے کہ ایک ممکنہ پالیسی یہ ہوسکتی ہے کہ کچھ عرصے کیلئے ان اسلام پسندوں کو حکومت کرنے دی جائے۔جس سے عوام کو ان کے سخت طور طریقوں اور نکمے پن کا تجربہ ہو جائے گا اور یوں وہ آئندہ ایسے لوگوں سے بچ کر رہیں گے۔دیکھئے جوناتھن پیریس۔
when to worry in the middle east. Orbis. www.icsrinfo/ images/when

۵۲۔ دیکھئے مریم ابو زہاب، Unholy Nexus : Taliban and sectariamism in Pakistan. Sciences Po/CERI 2009

۵۳۔ حکومت نے مالاکنڈ ڈویژن میں طالبان کے ساتھ نظام عدل کا معاہدہ کیا۔معاہدہ بالآخر ناکام ہوگیا حالانکہ حکومت نے سوات میں کافی باتوں پر سمجھوتے کئے۔اس کے باوجود حکومت کو فوجی کارروائی کیلئے کچھ حمایت بھی میسر آ گئی۔

۵۴۔ بھارت سے مختلف ہونے کا مسئلہ زیادہ تر اترپردیش (یوپی) اور مشرقی بنگال سے تعلق رکھنے والے امیر اور مڈل کلاس مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔آج آزادی کے ۶۲ سال بعد پاکستان ایک حقیقت ہے نہ کہ محض بھارت کی مخالفت سے پیدا ہونے والا کوئی تصور۔اسی طرح جیسے فرانس یا کوئی اور ملک ہے۔شجاع نواز ڈائریکٹر ساؤتھ ایشین سنٹر آف دی اٹلانٹک کونسل،ای میل

۵۵۔ کچھ ماہرین DID کے معنی سے اختلاف کرتے ہیں۔اس سلسلے میں جنرل کیانی (آرمی چیف) کا کہنا ہے کہ مغربی سرحدوں پر پاکستان کی سلامتی ایک مستحکم افغانستان سے تعلق رکھتی ہے۔سٹریٹیجک ڈیپتھ کے بارے میں دوسری رائے یہ ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں سے لیس پاکستان اور بھارت پر اب اس کا اطلاق نہیں ہوتا، بلکہ پاکستان اس کے ذریعے افغانستان کے ذریعے سنٹرل ایشیاء تک رسائی چاہتا ہے۔

۵۶۔ پشتون کا عام مطلب غلزئی پشتون ہوتا ہے۔جو فاٹا اور جنوبی افغانستان میں اکثریت میں ہیں۔ان کی اکثریت دیہاتی اور غیر مہذب ہے۔ان کے مقابلے میں درانی پشتون ہیں جو شہری اور مہذب ہیں اور روایتی طور پر افغان حکومت کی تشکیل انہی کے ذریعے ہوتی ہے۔

۵۷۔ جامع مذاکرات کے اگلے دور میں سیاچین گلیشئر، سرکریک اور دریائے چناب پر بھارت کے ڈیم بنانے پر بات چیت ہوئی۔جس پر پاکستان کو کچھ تحفظات ہیں۔

۵۸۔ سٹیوکول،دی نیویارکر ۲مارچ ۲۰۰۹ء

۵۹۔ بھارت ۱۹۷۲ء میں شملہ معاہدے کے بعد سے اس موقف پر قائم ہے،جس میں دونوں ملکوں نے اپنے تنازعات کو دوطرفہ بنیادوں پر طے کرنے پر اتفاق کیا تھا۔

۶۰۔ پاکستان میں سابق بھارتی ہائی کمشنر جی پارتھا سارتھی نے انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ فار سٹریٹیجک سٹڈیز میں خطاب کے دوران کہا۔جولائی ۲۰۰۸ء لندن۔

۶۱۔ بھارت میں بھی سب لوگ اس بات سے متفق نہیں ہیں۔بھارتی عوام نہیں جانتے کہ انہیں پاکستان کے ساتھ کرکٹ کھیلنی چاہیے۔تجارت کرنی چاہیے یا اسے تباہ کر دینا چاہیے۔سٹیفن کوہن، خطاب انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ ریسرچ سنٹر، اوٹاوہ کینیڈا،اپریل ۲۰۰۹ء

۶۲۔ بھارتی خفیہ ایجنسی پر الزام ہے کہ وہ بلوچستان میں علیحدگی پسندوں اور عوامی نیشنل پارٹی کی مالی مدد کرتی ہے جس نے ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں مذہبی جماعتوں کے اتحاد کو شکست دی۔پاکستان کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ را فاٹا میں بیت اللہ محسود کی تحریک طالبان پاکستان کی مدد بھی کرتی رہی ہے۔جبکہ آئی ایس آئی پر الزام ہے کہ اس نے سکھ علیحدگی پسندوں کی مدد

کی ،اس کے علاوہ وہ شمال مشرقی بھارت میں متعدد لسانی تحریکوں کو بھی مدد دیتی رہی ہے۔جبکہ کشمیر اور بھارت کے جہادی گروپوں کی مدد اس کے علاوہ ہے۔جس کے نتیجے میں ۱۹۹۲ء میں ممبئی سٹاک ایکسچینج میں بم دھماکے ہوئے۔

۶۳۔ جولائی ۲۰۰۸ء کو حکومت پاکستان نے اعلان کیا کہ اب آئی ایس آئی وزارت داخلہ کے ماتحت کام کرے گی۔یہ فیصلہ چوبیس گھنٹے ہی میں کور کمانڈروں کے اعتراضات کے سبب واپس لے لیا گیا،اسی طرح دسمبر ۲۰۰۸ء میں اعلان کیا گیا کہ آئی ایس آئی کا سیاسی ونگ بند کیا جا رہا ہے۔یہ ونگ اندرون ملک سیاسی جماعتوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے (الیکشن میں دھاندلی) پر مامور ہے۔ابھی تک اس فیصلے پر عملدرآمد کے بھی کوئی امکانات نظر نہیں آئے۔

۶۴۔ بھارت کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ اس کے معمولی اقدامات سے بھی پاکستان کے شبہات سر اٹھانے لگتے ہیں اور پاکستانی فوج کو اپنا بھارت مخالف ایجنڈہ آگے بڑھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ بھارت اپنے عوام سے چھپا کر مفاہمت کر سکتا ہے لیکن سیاسی دباؤ کے باعث وہ عوامی طور پر ایسی رعایتیں نہیں دے سکتا۔ کچھ ماہرین را کی معصومیت پر بھی یقین نہیں کرتے۔ بھارت پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کی تاریخ رکھتا ہے (مثلاً مشرقی پاکستان / بنگلہ دیش ، سندھ، بلوچستان) اور آئی ایس آئی را جیسی ایجنسیوں سے اپنے طریقے سے نمٹتی ہے اور اس سے خیالات میں تبدیلی کا عمل سست ہو جاتا ہے۔ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ بھارت مذاکرات شروع کرنے کا کتنا خواہش مند ہے۔دیکھئے سدھارتھ وردا راجن، سخت سفارتکاری ہوم لینڈ سیکورٹی نہیں ہے۔دی ہندو ۱۵ دسمبر ۲۰۰۹ء۔ کچھ اور ماہرین کے خیالات مختلف ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ پاکستان کے بہت سے سویلین اور فوجی بھارت سے اچھے تعلقات کو قبول کر چکے ہیں۔لیکن چونکہ بھارت ان کی نہیں سنتا تو اب ان کیلئے امن کی بجائے بھارت کو غیر مستحکم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔را افغانستان میں کوئی اچھا کام نہیں کر رہی۔لیکن پاکستانی اس معاملے کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور امریکہ کو افغانستان میں بھارت کی نگرانی کیلئے کہتے ہیں۔لیکن دیکھا جائے تو را کی کارروائیوں کا پاکستانی کارروائیوں سے تقابل نہیں کیا جا سکتا۔پاکستان کی

سرکاری پالیسی یہ ہے کہ وہ بھارت کے خلاف طاقت کا استعمال نہیں کرے گا لیکن کشمیر کا متنازعہ علاقہ اس میں شامل نہیں ہے۔لشکر طیبہ وہاں کام کرتی ہے اور اسی نے ممبئی آپریشن میں حصہ لیا تھا۔

۶۵۔ دیکھئے سٹیفن کوہن ،اناوہ خطاب، ۹،اپریل ۲۰۰۹ء

۶۶۔ دیکھئے ہبرینا ٹیو رائز، سروے آف پاکستان، ''نوجوانوں کی ضرورتیں پوری نہ ہوئیں تو تباہی کا امکان ہے'' دی نیویارک ٹائمز ۲۲ نومبر ۲۰۰۹ء۔

۶۷۔ Pew Global attitude, Survey of Pakistan at www.pew.global.org/reports/d=265

۶۸۔ حسین حقانی، امریکہ میں پاکستان سفیر اور کارنیگی اینڈ ومنٹ فار انٹرنیشنل پیس مارچ ۲۰۰۶ء پاکستان وچین پر اظہار خیال

۶۹۔ ۲۰۰۸ء کے اولمپک کھیلوں کے دوران ارومچی سے بیجنگ کی پرواز میں لوگر کی ایک نوجوان عورت جہاز کے باتھ روم میں آتش گیر مواد تباہ کرنے کی کوشش میں پکڑی گئی۔چین کے اندرونی حلقوں کے مطابق اس خودکش عورت کو پاکستان کے کچھ لوگ استعمال کر رہے تھے۔گفتگو لین سن زیانگ ،جینوا، ستمبر ۲۰۰۹ء

۷۰۔ دیکھئے ، امریکہ کے طالبان کے ساتھ بیک چینل مذکرات ، روزنامہ ڈان ۲۴ نومبر ۲۰۰۹ء۔

۷۱۔ کچھ تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ امریکہ کی نئی پالیسی صدر نکسن کی جانب سے جنگ کو پھیلانے کی کوشش سے ملتی جلتی کوشش ہے۔جس کا مقصد یہ تھا کہ جنگ کی مدد سے انہیں باعزت واپسی کا آخری موقع مل جائے۔لیکن اس سے کمبوڈیا تباہ ہو گیا اور جنوبی ویتنامی عوام کی زندگی ضائع کر دی گئی۔کیا اس بار ایٹم بم سے پاکستان کو جنوبی ویتنام بنایا جائے گا۔

۷۲۔ دیکھئے ڈیوڈ سینگر، ایرک شمٹ، پاکستان کی طالبان کے خلاف لڑائی کو ایک رخ میں لے جانے کو کہا گیا ہے۔نیویارک ٹائمز، ۷ دسمبر ۲۰۰۷ء

۷۳۔ لائیٹ فٹ پرنٹ سٹریٹیجی کو نائب صدر جو بائیڈن سے منسوب کیا جاتا ہے، جو انہوں نے اوباما سٹریٹیجی کے ابتدائی ہفتوں میں ایک جائزے کے دوران پیش کی۔یہ پالیسی انسداد

دہشت گردی پر مبنی ہے اور القاعدہ کے مکمل خاتمے کیلئے ڈیزائن کی گئی ہے۔

۷۴۔ دیکھئے اناٹول لیون اور ملیحہ لودھی، ''اوباما کو پلان بی کی ضرورت ہے'' نیو یارک ٹائمز ۹ دسمبر ۲۰۰۹ء۔

۷۵۔ جنرل مشرف کی جانب سے ۲۰۰۷ء میں لال مسجد پر حملے کے فیصلے کے بعد طالبان کا کینسر جان لیوا ہو گیا، اور اس سے پاکستانی طالبان پاک فوج کے خلاف ہو گئے۔ ان اختلافات کے نتیجے میں امریکہ کی جانب سے طالبان کے خلاف کارروائی کا دباؤ کم ہو گیا، گفتگو افضل امین، کیپٹن برٹش آرمی اور لیکچرر ڈیفنس اکیڈمی ریسرچ اینڈ اسیسمنٹ برانچ ۲۰، نومبر ۲۰۰۹ء۔

۷۶۔ مستقبل میں زیادہ فائدہ حاصل کرنے کا سوال اندازوں پر مبنی ہے۔ ایک جانب امریکہ کو فائدہ ہے کہ اب اسے بگرام اور دوسرے امریکی اڈوں پر پاکستان کی جانب سے مزید سپلائی کی ضرورت نہیں۔ جبکہ افغانستان میں جنگ پھیلنے سے پاکستان کو فنڈز کی فراہمی میں کمی ہو سکتی ہے۔ دوسری جانب خیال ہے کہ مستقبل میں پاکستان کو زیادہ فائدہ ہو گا کیونکہ امریکہ پاکستان کی سلامتی کیلئے فکرمند ہے۔ پاکستان کا خیال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جتنا کمزور ہو گا امریکہ اتنا ہی فکرمند ہو گا اور اسے نظر انداز نہیں کر سکے گا، خواہ اس سے افغانستان اور بھارت میں اس کے مفادات متاثر ہو رہے ہوں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ امریکہ اور برطانیہ ہر صورت میں پاکستان کا خیال رکھیں گے۔ ایک پالیسی یہ ہے کہ اگر حکومت پاکستان طالبان کے ساتھ اشتراک جاری رکھتی ہے جس سے القاعدہ کی تربیت گاہوں میں بریڈفورڈ، لیڈز، لندن، یورپ اور امریکہ کے نوجوان مسلمانوں کو دہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہے تو امریکہ اور برطانیہ یہ بات برداشت نہیں کریں گے، مثلاً حال ہی میں پاکستان سے گرفتار ہونے والے پانچ امریکی مسلمانوں کی گرفتاری کا مسئلہ دیکھ لیں۔ نیو یارک ٹائمز ۱۰ دسمبر ۲۰۰۹ء۔

۷۷۔ ایک پاکستانی اخبار میں تجویز کیا گیا کہ جو پاکستانی جنرل افغان طالبان کی حمایت کرتے ہیں انہیں افغانستان بھیجا جائے تا کہ وہ بھارت کے خلاف سٹریٹیجک ڈیپتھ حاصل کر سکیں، ایاز امیر، دی نیوز انٹرنیشنل ۱۱ دسمبر ۲۰۰۹ء۔

۷۸۔ کئی مضامین میں اس مسئلے پر بات کی گئی ہے۔ دیکھئے کرچن بروس اور ڈان ٹوانگ ''ہمارے پاکستان کا مسئلہ'' ہفت روزہ سٹینڈرڈ ۱۴ ستمبر ۲۰۰۹ء۔ اگرچہ امریکہ معمول کے تعلقات قائم کر سکتا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کرتا، کئی ضروری وجوہات کے سبب، پاک بھارت کے درمیان مسئلہ کشمیر کے حل سے علاقہ پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔ جس سے افغانستان میں امریکہ اور نیٹو کی پالیسی کو ہم آہنگ کرنے میں مدد ملے گی۔ مشرق وسطیٰ میں اسرائیل اور فلسطین کا مسئلہ حل ہونے سے پورے خطے کو فائدہ ہو سکتا ہے۔ ان تمام مسائل کا حل بہت ہی اہم ہو سکتا ہے لیکن سچی بات ہے کہ ۶۲ سالہ پرانے یہ دونوں مسئلے جلد حل ہوتے نظر نہیں آتے۔

۷۹۔ دیکھئے، آصف زرداری، ''پاکستان کے ساتھ اختلافات کیسے ختم ہوں'' ۱۰ دسمبر ۲۰۰۹ء، نیو یارک ٹائمز۔

۸۰۔ دراصل امریکہ اور عالمی معاہدہ کاروں کے درمیان معاملات طے پانے کا مسئلہ ایک طرف ہے لیکن دوسری جانب حکومت پاکستان، ملکی وزارتوں، این جی اوز کو پیسہ دینے کا مسئلہ ہے، جن کی صلاحیتیں بے حد محدود ہیں، پاکستانی این جی اوز کی صلاحیتیں محدود ہیں اور ان کے ذریعے کیری لوگر کی دس فیصد سالانہ امداد بھی نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے اگر امریکہ اس پروگرام کو مقامی بنیادوں پر چلانا چاہتا ہے تو اسے یہ حکومت کی وزارتوں کے ذریعے کرنا ہو گا، اگرچہ وہاں بھی جوابدہی اور شفافیت کے کئی مسائل درپیش ہیں۔ اس سلسلے میں ایک تجویز یہ ہے کہ وزارتوں کے ساتھ بیرونی ماہرین کی ٹیم منسلک کر دی جائے۔ جو پروگرام اور اخراجات کو چیک کرے۔

۸۱۔ اوباما سٹریٹیجی پر پاکستان سے کئی لوگوں نے تنقید کی ہے، دیکھئے، منیر اکرم، ''نئی امریکی پالیسی اور پاکستان کا ردعمل'' دی نیوز انٹرنیشنل ۱۴ دسمبر ۲۰۰۹ء ایک اور مصنف نے اسی اخبار میں لکھا ہے کہ پاکستان کے نقطہ نظر سے جنگ پھیل رہی ہے، جبکہ ہمیں اسے محدود کرنا ہے، ہمیں یہ جنگ اپنی سرحدوں کے اندر خود لڑنی ہو گی، امریکہ کے ساتھ منتھی ہوئے بغیر۔ دیکھئے ایاز امیر۔ دی نیوز انٹرنیشنل ۱۱ دسمبر ۲۰۰۹ء۔

☆☆☆